شاہکار مراکشی ناول
عام
لیلیٰ ابو زید
ترجمہ: عارفہ سیدہ زہرا

ابابیل

شاہکار مراکشی ناول

لیلیٰ ابوزید

ترجمہ: عارفہ سیدہ زہرا

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیوگارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

تعارف

لیلیٰ ابو زید کا ناول ''ابابیل'' ایک مراکشی خاتون کے سفر کی کہانی ہے۔ مجبوری، بے بسی اور بے یقینی سے خود اعتمادی اور زندگی کو سمجھنے اور قبول کرنے تک کا سفر۔ اس سفر کی یہ کہانی مراکش کی ادبی اور تہذیبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ یہ پہلا ناول ہے جو کسی مراکشی ادیبہ نے عربی زبان میں لکھا ہے اور پھر انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ باربرا پارمنٹر نے ترجمہ کی اس ذمہ داری کو خوب نبھایا ہے یہ اولیت تو اس مترجم اور ناول دونوں کو میسر ہے ہی کہ اس سے پہلے کسی مراکشی ادیب کی تحریر انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوئی۔

جدید مراکشی ادب کو ابھی حال ہی میں بین الاقوامی توجہ ملی ہے۔۱۹۸۲ء وہ موڑ ہے جب طاہر بن جلون کی ''شب پاکیزہ'' فرانس کے سب سے موثر ادبی انعام ''یعنی ژنکو'' کی مستحق قرار پائی۔ یہ وہ لمحہ ہے جب دنیا مراکشی ادب سے متعارف ہوئی۔اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۹ء میں آیا۔لیکن ایک بڑا فرق یہاں یہ ہے کہ بن جلون عربی میں نہیں لکھتے، جو شمالی افریقی ادیبوں کا عام قرینہ ہے۔لن آرٹزن نے ۱۹۷۰ء میں اپنی کتاب ''شمالی افریقی تحریریں'' کے ذریعے پہلی بار بہت سے افریقی ادیبوں کو انگریزی جاننے والی دنیا سے روشناس کرایا۔اس کتاب میں نو ادیبوں کا ذکر ہے۔آٹھ مرد، ایک عورت۔ یہ سب ادیب فرانسیسی میں لکھتے رہے ہیں۔ مراکشی ادیبوں میں سے صرف دو، دریس شریبی اور احمد صفوری شامل ہیں۔ واحد خاتون الجزائر سے ہیں--آسیہ جبار۔

طاہر بن جلون، آرٹزن کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ وہ ۱۹۴۴ء میں فیض میں پیدا ہوئے اور پیرس میں رہتے ہیں۔اس سے پہلے ان کا ناول ''ریگ زادہ'' تیرہ زبانوں میں چھپ چکا ہے۔شروع کے تبصروں میں اس کا ذکر کچھ یوں کیا گیا ہے''دیو مالائی، علامتی، شاعرانہ---یا طنزیہ---'''' عرب مردوں اور عورتوں کی سماجی حیثیت کی ایک

خوابناک تعبیر''---''شب پاکیزہ'' کا مرکزی خیال بھی مراکش کی آزادی کی جدوجہد سے منسلک ہے۔حقیقت اور تمنا کے تانے بانے سے بنی ہوئی خواب اور استعارہ کی کہانی۔جس میں رنج،منافقت اور حرص و ہوس کے سارے رنگ جھلکتے ہیں۔آرٹن اس سے پہلے جو مراکشی ادب پارے ترجمہ کئے ان کا موضوع بھی آزادی کی جدوجہد ہی تھا۔یہ تحریریں ساٹھ کی دہائی میں لکھی گئیں۔فرانسیسی سامراج کے تسلط سے رہائی،آزادی کی کشمکش کا ردعمل،ایک تشخص کی تلاش اور اقتصادی تحفظ کی تدبیر ان تحریروں کا مرکزی اور واضح موضوع رہا۔

۱۹۸۰ء میں لکھا جانے والا،لیلیٰ ابوزید کا یہ ناول مرد ادیبوں کے ان ناولوں سے مماثلت بھی رکھتا ہے اور مختلف بھی ہے۔''ابابیل'' بھی مراکش کی جدوجہد آزادی اور اس کے اثرات کی کہانی ہے۔لیکن یہ کہانی اوسط طبقے کی ایک محنت کش خاتون کے زاویہ خیال اور اس کے تجربوں کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔بن جلون کی طرح اس تحریر کا بھی عرب معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے سماجی کردار سے گہرا تعلق ہے۔لیکن اس کا زاویہ خیال ایک مرد کا نہیں،ایک عورت کا ہے۔اسلوب بے ساختہ ہے۔خواب سے زیادہ حقیقت کی طرح۔لہجہ تلخ نہیں ہے مگر زندگی کے تجربوں کی گونج لئے ہوئے ہے۔

یہ حقیقت کہ لیلیٰ ابوزید فرانسیسی کے بجائے عربی میں لکھتی ہیں اس ناول کی نمایاں خصوصیت ہے۔صاحب کتاب کو تین زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے،لیکن اپنے اظہار کے لئے انہوں نے عربی کو منتخب کیا ہے۔اس کی وجہ ان کے خیال میں سیاسی بھی ہے اور ذاتی بھی۔عربی میں لکھنے کی اس خواہش اور شعوری کوشش کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ بات اہم ہو جاتی ہے کہ ہم صرف تحریر ہی کو نہیں،صاحب تحریر کو بھی اس تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

ابوزید ۱۹۵۰ء میں القصبہ کے ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ یہ وسط اٹلس کا ایک رقبہ ہے جہاں ان کے والد فرانسیسی انتظامیہ کے لئے مترجم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔۱۹۵۶ء میں جب مراکش کو فرانسیسی سامراج سے آزادی نصیب ہوئی تو لیلیٰ کا سن چھ برس کا تھا۔آزادی کی اس جدوجہد میں لیلیٰ کے والد بھی شریک تھے۔ مراکش کے اعلیٰ طبقے کے قرینے کے برعکس لیلیٰ نے فرانسیسی اسکول کے بجائے مراکشی

اسکول میں تعلیم پائی۔ جہاں فرانسیسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تدریس میں عربی کو فوقیت حاصل تھی۔محمد پنجم یونیورسٹی، رباط میں تعلیم پانے کے بعد انہوں نے لندن اسکول آف جرنلزم سے تعلیم حاصل کی۔تعلیم مکمل کرنے پر انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور مراکش کے مقامی رسالوں اور اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔وزارت اطلاعات اور وزیر اعظم کے دفتر میں پریس اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔قومی ریڈیو کے ایک بڑے مقبول اور مشہور تقریری پروگرام کی مصنف اور میزبان کے طور پر شہرت حاصل کی۔مراکشی ٹیلی وژن کے نئے چینل پر میزبان کی حیثیت سے کام کیا۔اس حیثیت میں کام کرنے سے لیلیٰ کو مراکشی مردوں اور عورتوں کے مسائل کے متعلق آگاہی ہوئی۔وہ چاہے شہر سے ہوں یا دیہات یا معاشرے کے کسی بھی حصے سے ہوں، لیلیٰ اُن سے واقف ہوئیں۔لیلیٰ آزاد مراکش کی پروردہ اور نمائندہ ہیں۔ان کی نسل وہ ہے جس نے ایک نئی اور آزاد حکومت کی سرپرستی میں بلوغت حاصل کی۔انہیں جو معاشرہ ملا، وہ اس معاشرے سے بالکل مختلف تھا، جس کا تجربہ ان کے والدین کو ہوا تھا۔''ابابیل'' تین مسائل سے بحث کرتا ہے اور یہ تینوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔تاریخ کا مسئلہ، قومی زبان کا مسئلہ اور عورتوں کی حیثیت کا مسئلہ۔

الجزائر کے خونی انقلاب نے مغربی مبصرین کے لئے مراکش کی قومی تحریک آزادی اور دنیائے اسلام پر اس کے دیرپا اثر کو دھندلا دیا۔لیکن مشرق وسطیٰ کی قومی تحریکوں میں مراکش کی جدوجہد آزادی نے ایک بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔سامراجیت کے خلاف مراکشی مزاحمت کے تجربے نے مراکش کو ایک مثالی حیثیت عطا کی ہے۔مراکش کبھی اس خلافت عثمانیہ کا حصہ نہیں رہا جس کا دائرہ اختیار مشرقی یورپ سے لے کر عرب اور شمالی افریقہ کی مملکتوں تک محیط تھا۔بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان تمام ممالک تک جو آج مشرق وسطیٰ کے نام سے موسوم ہیں۔مراکش کی تاریخ اپنی نوعیت میں بے نظیر ہے۔اس معاملے میں مغربی اور مشرقی ماہرین متفق ہیں۔ان کے خیال میں ابھی ماضی قریب تک مراکش کا علاقہ ایک دوسرے منسلک مگر اپنے طور پر مختلف حصوں پر مشتمل تھا۔شہروں میں مرکزی حکومت کی ایک صورت ''بلدالمخزن'' کی شکل میں موجود تھی۔لیکن اندرونی علاقوں میں قبیلوں نے اپنے اپنے قانون وضع کئے تھے اور اسے ''بلدالسبا'' کا نام دیا تھا۔یعنی کہ اختلاف کرنے والوں کے علاقے۔یہ قبیلے حاکم وقت کو سالانہ خراج بیعہ ادا کرتے

تھے۔ یہ آپس کے قبائلی اختلافات کو کم کرنے کی ایک علامت تھی۔لیکن ان کی عمومی زندگی ہر لحاظ سے خود مختار تھی۔سترھویں صدی میں پرتگالی اور برطانوی تاجر مراکش کے اٹلانٹک ساحل پر بس گئے تھے۔یہاں بحری قزاق بھی عام تھے۔لیکن مراکش کے مخزن اور سبا کے اندرونی غیر متناسب اقتدار کر اس صورت حال سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔انیسویں صدی میں ہسپانوی اور پھر فرانسیسی حملوں نے اس صورت حال کو متاثر کیا۔

لیلیٰ ابوزید کے ناول کی روح کو سمجھنے کے لئے مراکشی تحریک آزادی کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔مورخ مغربی سامراج کی ابتداء ۱۷۹۸ء کے شروع سے متعین کرتے ہیں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا۔الجزائر میں فرانسیسی عمل دخل ۱۸۳۰ء سے شروع ہوا۔مراکش کو فتح کرنے میں کہیں زیادہ وقت لگا۔انیسویں صدی کے وسط تک مراکش کا سلطان شریف الجزائر کے امیر عبدالقادر کو اسلحہ اور سامان کی کمک بھیج رہا تھا تاکہ وہ فرانس کے خلاف مزاحمت جاری رکھ سکیں۔گو فرانسیسی ایک بڑی تعداد میں الجزائر میں رس بس گئے تھے انہوں نے اپنا قبضہ جما لیا تھا اور الجزائر کی زمین پر کاشت شروع کر دی تھی۔ مراکش کی مزاحمت کا چیلنج فرانسیسیوں کے لئے معمولی بات نہ تھی۔انہوں نے مراکش پر ایک بھرپور حملہ کیا اور پہلی اگست ۱۸۴۴ء کو مراکشی فوج کو امیلی کے مقام پر پسپا کر دیا۔اس کے بعد سلطان نے الجزائر کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا۔۱۸۶۰ء میں اسپین نے مراکش کے بحیرہ روم کے شمالی ساحل پر ایک اہم شہر طیطوان پر قبضہ کر لیا۔اس وقت تک مراکش کی لڑائی فرانس اور اسپین دونوں کے خلاف جاری تھی۔ایک مدت بعد فرانس نے بہت سے باغی قبیلوں کو رام کر لیا اور دوسرے قبیلوں کو خوش رکھنے کے لئے بہت سی مصالحتی کوششیں کیں تاکہ ان کی حمایت حاصل ہو سکے۔اسپین کے اشتراک سے ایک حفاظتی حکومت قائم کی جو چوالیس سال تک برقرار رہی۔

۳۰ مارچ ۱۹۱۲ء کو حفاظتی حکومت کے قیام کے اعلانیہ پر دستخط ہو جانے کے باوجود مراکشی مزاحمت ختم نہیں ہوئی۔دراصل یہ کبھی ختم بھی نہیں ہوئی۔دس سال بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ریف کی مشہور بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ایک بے حد امیر زمیندار محمد عبدالکریم خطابی اس کا لیڈر تھا۔جسے یہ بات کسی طرح گوارہ نہ تھی کہ فرنگی اس کی املاک کو اپنے تصرف میں کر لیں۔پہلے اس نے ہسپانوی حکمرانوں کی حکم عدولی شروع کی اور پھر

۱۹۲۱ء میں فرانسیسیوں کو بھی درخور اعتنا نہ جانا۔اس طرح وہ ریف کے علاقے کے قبیلوں کے ایک بڑے اتحاد کا سربراہ بن گیا۔ یہ علاقہ مراکش کے شمالی پہاڑی علاقہ پر مشتمل تھا وہ اس علاقے میں اگلے پانچ سال تک اسپین اور فرانس دونوں سے چومکھی لڑتا رہا۔ ریف کی اس بغاوت کو اس وقت تو امریکہ اور یورپ نے توجہ کے لائق نہ جانا لیکن مسلم دنیا کی توجہ نے اس کو جذب کیا۔ وجہ یہ تھی مسلم اقوام خود ۱۹۱۹ء میں ورسائے معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد سے یورپی طاقتوں کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں۔ ورسائے معاہدہ سے عرب دنیا کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ برطانیہ اور فرانس نے ان سے یہ وعدہ کرلیا تھا کہ اگر وہ جرمنی کی مخالفت میں مدد کرتے رہے تو انہیں خودمختاری مل جائے گی۔لیکن معاہدے کی شقوں سے ہی یہ سارے وعدے کالعدم ہو گئے۔ برطانیہ،فرانس اور اسپین نے خلافت عثمانیہ کو واقعتاً اپنے درمیان تقسیم کرلیا تھا۔انہوں نے حفاظت کے حیلے بہانے مشرق وسطیٰ میں اپنا قبضہ واختیار قائم کرلیا تھا۔ان ملکوں کے ہر احتجاج کو پس پشت ڈال دیا جن سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا۔مراکش بھی ان ہی میں شامل تھا۔

ریف کی بغاوت جاری رہنے سے یورپی سامراج کے خلاف موثر مزاحمت کو جاری رکھنے کی امیدیں بڑھ گئی تھیں۔آزادی کی خاطر مزاحمت میں شریک ہونے والوں کے لئے چندوں سے رقم جمع کی گئی۔ یہاں تک کے ہندوستان بھی ان مدد کرنے والوں میں شامل تھا۔اس مہم کی کامیابی تیونس کی تحریک آزادی کے لئے ایک مثبت علامت بن گئی۔انہوں نے بھی اسی طرح امداد جمع کرنا شروع کی۔ بقول سی آر پینیل ''شہر میں رہنے والوں کے لئے ایک نئی دیومالا ابھری،جس کا محور ریف کا سردار تھا۔اصل بات یہ تھی کہ دو چھوٹے اور معمولی قبائلی فوجی دستوں نے یورپ کی دو بڑی مملکتوں کی فوج کو پسپا کر دیا تھا۔ یہ بات روایت اور وراثت کے طور پر ہی سہی،لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ بعد میں یہی تمام مزاحمت کی بنیاد بنی۔عبدالکریم وہ نام ہوا جو ۱۹۵۰ء کے واقعات میں بار بار دہرایا گیا۔یہی واقعات ''ابابیل'' کی ڈرامائیت میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔صرف اسپین کا تخمینہ یہ تھا کہ بغاوت کے شروع کے سالوں میں دس ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور ایک پوری فوج تو سرے سے ہی ختم ہوگئی۔

۱۹۲۶ء میں آخر کار،عبدالکریم کے بیٹے نے ہتھیار ڈال دیئے۔اسے فرانسیسی

کالونی ری یونین میں جلا وطن کیا گیا۔تاہم ریف کی بغاوت کے اثرات باقی رہے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ری یونین سے بچ نکلا اور قاہرہ میں جا کر رہنے لگا۔۱۹۶۳ء میں وفات تک وہیں رہا۔وہ نارتھ افریقن ڈیفنس لیگ کا لیڈر تھا جو نارتھ ویسٹ افریقن نیشنلسٹ کی ذیلی تنظیم تھی۔

ناول کی مصنفہ کی توجہ مراکش کی جدوجہد آزادی کے آخری مرحلے کے واقعات پر ہے۔جس کے متعلق دانشوروں کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا ۲۲ جنوری ۱۹۴۳ء کو ہوئی۔ یہ وہ دن تھے جب کیسابلانکا میں امریکی صدر فرینکلن روزولٹ اور سلطان سیدی محمد یوسف کے درمیان ملاقات ہوئی۔امریکہ کی طرز سیاست اس عہد کے لئے ایک مثال بن گئی۔امریکی بل آف رائٹس کی خصوصیات قومی تحریکوں کی تحریروں میں حق خود اختیاری کی گونج بن کرا بھریں۔

لیلیٰ ابوزید کے اس ناول کا انتساب یوں ہے ''میں یہ کتاب ان مردوں اور عورتوں کے نام منسوب کرتی ہوں جنھوں نے مراکش کی آزادی کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں لیکن اس کی توقع نہیں رکھی کہ انہیں اس کا انعام ملے یا ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔'' لیلیٰ کا خیال ہے کہ مراکش کی اکثریت اس جدوجہد میں شریک تھی۔ یہاں تک کہ بذات خود سلطان بھی جو بعد میں سلطان محمد پنجم کے نام سے آزاد مراکش کے پہلے اور ہر دلعزیز حکمران بنے۔حاکم ہونے کا یہ تجربہ بھی مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ مثال کے طور پر مصر کے شاہی خاندان کی تحریک آزادی میں شمولیت، درحقیقت برطانوی حکومت کی ساز باز پر مبنی تھی۔۱۹۵۲ء میں جمال ناصر اور محمد نجیب کی قیادت میں افسروں کی بغاوت ہوئی اور شاہ فاروق کو معزول کر کے جلاوطن کیا گیا۔اس کے برعکس مراکش کا سلطان سب سے اہم قومی پارٹی استقلال کا معاون وممد تھا۔اس جرم وفا پر فرانسیسیوں نے اسے جلاوطن کیا۔وفا رنگ لائی اور وہ مراکش کا قومی ہیرو بن گیا۔لیلیٰ ابوزید کی زہرا نے سلطان کی جلاوطنی کا اثر جس پیرائے میں بیان کیا ہے وہ افسانوی سے زیادہ سچا اور لوگوں کے جذبات کا صحیح عکاس ہے۔سلطان کی ہر دلعزیزی بڑھتی گئی اور مراکش کے عوام، دوری کے باوجود، جذباتی طور پر سلطان کے قریب ہوتے گئے۔اس کی شخصیت پر تقدیس کا رنگ چڑھتا گیا۔یہ ایک ایسا تعلق ہے جو انسان کے پیکر سے زیادہ

کیس اصول یا آئیڈیل سے ہو سکتا ہے۔ مراکشی عوام کے لئے سلطان کی جلاوطنی نے فرانس کے خلاف غصہ اور نفرت کے لئے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

یہ ناول تاریخی ناول نہیں ہے۔ نہ تاریخ اس پر مسلط ہے۔لیکن پورے ناول میں واقعات کی نوعیت میں تاریخ جھلکتی ہے۔ ناول کا بیانیہ، روزمرہ کے اس معمول سے منسلک ہے جو ناول کے مرکزی کردار زہرا کی زندگی ہیں۔ اس کا بچپن، شادی، آزادی کی وہ تحریکیں جن میں وہ شامل رہیں، اس جدوجہد کی فتح، نئی حکومت کا قیام، اس نئی حکومت میں اس کے شوہر کا اہم عہدہ، اس کی طلاق، زندگی سے بلاواسطہ سامنا اور پھر ان سارے تجربوں کی میزان پر پرکھا ہوا اس کا تجزیہ کہ آزادی اصل میں ہوتی کیا ہے؟

مورخین اور ماہرین سیاست کے خیال میں ۱۹۵۲ء ہونے والا کیسا بلانکا کا قتل عام اس پوری جدوجہد کی مزاحمت کا اہم موڑ ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کے نیویارک ٹائمز نے فرانسیسی پولیس کی بہیمیت کا ذکر کیا جس میں سینکڑوں نہتے اور بے گناہ شہری مارے گئے۔ اس واقعہ کے بعد سے عام مراکشی شہری بھی حریت پسندوں کی مدد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیلیٰ ابوزید کی ہیروئن بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔

مصنفہ نے مراکشی جدوجہد کے لئے تاریخ سے جو استعارہ تلاش کیا وہ ''ابابیل'' کا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ اس لئے استعارے کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ چھٹی صدی عیسوی کا یہ واقعہ معاشی اور سیاسی اغراض کے مضمرات پر مبنی ہے۔ جب ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی وہ اپنی فوج اور ہاتھیوں پر ناز کرتا آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا اگر اہل مکہ مقابلہ نہ کریں گے تو ان سے تو کچھ غرض نہ رکھے گا لیکن کعبہ کو ڈھا دے گا۔لیکن ہاتھیوں کی ہیبت نا کی، اور فوج کا طنطنہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ نے کنکریاں مار مار کر خاک میں ملا دیا۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا، اہل عرب اسے ہاتھیوں کا سال کہتے ہیں اور اسی سال رسول کریمؐ کی ولادت بھی ہوئی۔ یہ جنگ نہ تعداد سے جیتی گئی نہ اسلحے سے۔ بہت ہی معمولی اور بے نام فاتح تھے اس جنگ کے۔ ان کا سامان حرب بھی انتہائی کم وقعت تھا۔ پرندوں کے غول اور ان کی چونچ میں کنکریاں۔ دیوہیکل جانور اور مسلح فوجی ان کا حملہ نہ سہار پائے اور پسپا و خوار ہوئے۔

اس استعارہ سے لیلیٰ ابوزید مراکش کی جنگ آزادی کی فتح کا کارنامہ بھی

عام، معمولی، بے وقعت اور بے دست و پا شہریوں سے منسوب کرتی ہیں۔ زہرا اسی معمولی، کم وقعت اور بے نام غول میں سے ایک ہے لیکن اس جیسے لوگوں کی بدولت ہی فرانس کے خلاف مزاحمت کامیاب وسرخرو ہوئی۔ لوہار، خانہ دار عورتیں پنساری، قالین فروش، لاری ڈرائیور، جیسے لوگ تھے جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کے آزادی کے لئے اپنے اپنے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ ان جیسے لوگ کتابوں میں ''مظاہرین'' یا احتجاج کرنے والا'' کہلا کر بے نام ونشان رہ جاتے ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ نے انہیں چہرہ اور نام دیا ہے۔ وہ چاہے پنساری ہو جس کے ہاتھ پر رسولی کی طرح چھٹی انگلی ہے۔ یا وہ ہنس مکھ لوہار، جو امید کی لو بجھنے نہیں دیتا، یا وہ خاتون جو اپنے گھر کا گودام پناہ گاہ بنا لیتی ہے، یا ویت نام کی جنگ کا زخم خوردہ لنگڑا سپاہی۔ سب اپنی اپنی جگہ ہاتھیوں پر کنکریوں سے حملہ کرتے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔

اپنے کردار کے ردعمل سے مصنفہ اپنے پڑھنے والوں کو اس تجربے کا حصہ بنا لیتی ہے۔ ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو مراکش کی آزادی کا اعلان ہوا۔ لیلیٰ ابوزید اس دستاویز کی سرکاری تفصیل کی گریز کرتی ہیں۔ ناول میں پوری توجہ بادشاہ کی فاتحانہ واپسی پر مرکوز ہے اور لوگوں کی خوشی کے اس شدید ردعمل کا موثر اظہار ہے جو برسوں کے غم وغصہ اور محرومی کے بعد نصیب ہو پائی۔ اپنے حاکم کی اپنی زبان میں تقریر کی آزاد سرزمین میں گونج لوگوں کے دلوں میں برسوں زندہ رہی۔ تاریخ لوگوں کی جذباتی زندگی پر کتنے ان مٹ نشان چھوڑ سکتی ہے، لیلیٰ ابوزید کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتی ہے۔

قومی تشخص میں زبان کی حیثیت کلیدی ہے۔ غلامی میں زبان اختیار کا ایک بڑا وسیلہ بنتی ہے۔ مراکش کی چالیس سال کی محکومی فرانسیسی زبان کی برتری کا عرصہ ہے۔ وہ فاتحوں کی زبان تھی، سرکار کی زبان تھی، تجارت اور تعلیم کا ذریعہ تھی۔ مکمل اختیار کا ایک ذریعہ اظہار۔ عربی صرف مذہبی معاملات تک محدود تھی۔ جہاں کلاسیکی زبان استعمال ہوتی تھی، یا اس چھوٹے سے حلقے میں جہاں عربی کا مغربی لہجہ روزمرہ تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر، مراکش میں جتنا بھی جدید ادب لکھا گیا وہ سب فرانسیسی میں لکھا گیا، عربی میں نہیں۔ مردوں نے لکھا عورتوں نے نہیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی معدودے چند فرانسیسی اسکولوں میں تعلیم پانے والوں میں مردوں کی تعداد عورتوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ تسلط کی یہ نفسیاتی

شکل محکوم معاشروں کی ذہنیت میں عام ہوتی ہے۔

زبان کا مسئلہ اور اس کا قوت واقتدار سے انتہائی نازک رشتہ فرانسیسی تسلط کے دنوں میں بھی اہم تھا۔فرانسیسیوں نے اپنے اور چند گنے چنے مقامی لوگوں کے بچوں کے لئے فرانسیسی اسکول قائم کئے اسی کے متوازی مراکشی عمائدین نے وہ اسکول قائم کئے جہاں عربی کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس طرح عربی زبان مزاحمت کی ایک علامت بن گئی۔قومی حکومت کے ابتدائی سالوں میں زبان کا مسئلہ بہت اہم رہا۔مراکش کے مستقبل کے فیصلوں میں تعلیمی نظام کو عربی سے منسلک کرنا اولین مقصد بن کر ابھرا۔اس پر عمل درآمد کرنا اتنا آسان نہ تھا۔اس لئے جیسا کہ بہت سے مبصرین نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ چند ہزار بچے جو مراکشی اسکولوں میں زیر تعلیم تھے انہیں عربی زبان کے لئے مہلت کم ملتی تھی۔ان کا زیادہ تر وقت فرانسیسی زبان اور دوسرے بنیادی اور اہم مضامین کی تدریس میں صرف ہوتا تھا۔آزاد مراکش کی ایک ایسی قوم کا سامنا تھا جس کی اکثریت جاہل اور غیر تربیت یافتہ تھی۔فرانسیسی حکومت کے بلند بانگ دعوے ایک طرف،حقیقت یہ تھی کہ ۱۹۵۰ء میں آزادی کے موقع پر صرف چالیس مرد یونیورسٹی گریجویٹ تھے اور صرف چھ لڑکیوں نے ہائی اسکول پاس کی۔اب ان چند ہزار بچوں کی استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو اسکولوں میں بظاہر پڑھتے تھے۔

ماہرین تعلیم کو،آزاد مراکش میں دیوہیکل دشواریوں کا سامنا تھا۔استقلال پارٹی نے ہر خواہشمند شہری کے لئے مفت تعلیم کا وعدہ کیا تھا۔اس پالیسی کو بھی واضح کر دیا تھا کہ سرکاری اور تدریسی زبان عربی ہوگی۔عربی کو وسیلہ تعلیم بنانے کا ارادہ اس لئے اولیت رکھتا تھا کہ یہ زبان عرب مسلم شناخت اور قومی تعمیر نو کی بنیاد بن سکے گی۔

عربی زبان کا عرب مسلم شناخت کی علامت بن جانا،تصوراتی حد تک انتہائی معقول اقدام معلوم ہوتا تھا۔لیکن عملی دشواریوں کے پیش نظر اس تجویز کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔مراکش کے بیشتر اساتذہ، چند مذہبی عالموں اور قرآنی مدرسوں کے سوا،سب فرانسیسی میں تربیت یافتہ تھے۔عربی میں تربیت یافتہ فوری طور پر تدریس کے لئے کہاں سے لائے جائیں؟ فرانسیسیوں نے بہت کم اسکول بنائے تھے۔ہر بچے کو تعلیم دینے کے لئے نئے اسکول بنائے بغیر اتنی کثیر تعداد کو کیسے پڑھایا جائے؟ محکومی میں نصاب تعلیم اور

امتحانوں کا نظام فرانسیسی طرز کا تھا۔ نیا نصاب تعلیم بنانے میں کتنا وقت لگے گا؟ اس نصاب تعلیم کی تشکیل کون لوگ کریں گے؟ نئی حکومت کے اکثر عہدیدار یا تو فرانس میں تربیت حاصل کر کے آئے تھے یا فرانسیسی اسکولوں میں ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ عربی میں ان کی مہارت انتہائی ناکافی تھی۔ ایک سمجھوتے کی راہ نکالی گئی۔ مراکش اپنے حالات کے پیش نظر دو زبانوں پر انحصار کرے گا۔ عربی کی ترویج اور ذریعہ تعلیم میں تبدیلی لانے کے لئے ایک وقت چاہئے تھا، اس لئے عبوری طور پر کوئی اور حل تلاش کرنا پڑے گا۔ عربی پر مکمل انحصار کے مدارج آہستہ آہستہ ہی طے پائیں گے۔

اس وقت جب زبان کے مسئلہ پر یہ بحث چل رہی تھی لیلیٰ ابوزید اسکول میں تھی۔ انہوں نے عربی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن اپنی تحریر کے لئے عربی کا انتخاب کی۔ صرف اس لئے نہیں کہ یہ زبان ان کے دین اور ان کے وطن کی زبان ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلم عرب دنیا میں رہتے ہیں۔ جہاں فرانسیسی یا انگریزی نہیں صرف عربی اکثریت کی زبان ہے۔ وہ اپنا دائرہ محدود نہیں کرنا چاہتیں، عوام تک پہنچنا چاہتی ہیں۔ وہ صرف ناول، افسانے اور تبصرے ہی عربی میں نہیں لکھتیں، اپنا ریڈیو پروگرام بھی عربی میں کرتی ہیں۔ وہ مراکش میں ریڈیو پر کلاسیکی عربی شاعری کی ڈرامائی پیشکش اور مراکشی فلموں کے منظرنامے عربی میں لکھنے کے لئے مشہور ہیں۔ وہ میلکم ایکس کی سوانح حیات بھی عربی میں لکھ رہی ہیں۔

زبان کا مسئلہ، مراکشی معاشرے میں عورت کے مقام اور کردار سے بھی منسلک ہے۔ قرون وسطیٰ میں عورتوں کو کلاسیکی عربی کی تعلیم دی گئی۔ بیسویں صدی تک کلاسیکی عربی، مذہب، قانون اور مردوں کی عملداری میں تھی۔ عربی زبان مختلف لہجوں اور بولیوں کی نمائندہ ہے۔ ایک زبان مختلف حوالوں سے مختلف لہجوں اور بولیوں میں استعمال ہوتی ہے۔ علم اور مذہب کے حوالے سے کلاسیکی عربی استعمال ہوتی ہے۔ ہر گھر کی چاردیواری میں غیر رسمی روزمرہ کی زبان بولی جاتی ہے۔ سامراجیت کے خاتمے اور ہر سطح پر عربی زبان کی تعلیم ترویج سے یہ تبدیلی آنا شروع ہوتی کہ جدید معیاری عربی پوری عرب دنیا میں ابلاغ کی مسلمہ زبان ہے۔ زمانہ وسطیٰ کے یورپ میں بھی ایسی ہی تقسیم موجود تھی۔ وہاں لاطینی علم و تہذیب کی زبان، مذہبی عالموں اور اعلیٰ سطح کے کچھ پڑھے لکھوں کی زبان تھی اور

یہ سب مرد تھے۔ جس دن سے روزمرہ نے معیاری ہونے کی سند پائی تب سے جدید ادب کا ارتقاء شروع ہوا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں اب آتی ہے کہ یورپ میں بھی اسی وقت سے عورتوں اور مردوں کی اکثریت نے لکھنا اور شائع ہونا شروع کیا۔

لیلیٰ کے قصوں کی زبان وہ عربی ہے جو آج مستند جدید عربی سمجھی جاتی ہے۔ ان کے مکالمے روزمرہ، مگر انتہائی مہذب لہجے میں ہوتے ہیں۔ ''ابابیل'' میں استعمال ہونے والی عربی بھی اپنی جگہ ایک اہم اور انوکھی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے انہیں ایک نئے اسلوب کا موجد کہا جاتا ہے کہ ان کا کام نئی اور پرانی دنیا کو زبان کی شطرنجی پر روبرو کر دینا ہے۔ ان کے تبصرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ زبان کی ساخت اور پرداخت کے حوالے سے، لیلیٰ جدید عرب شاعروں اور قصہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ ان کے جملے مختصر اور بڑے تہہ دار ہوتے ہیں۔ اسی لئے توجیہہ اور تشریح کے لامحدود امکانات پیدا کرتے ہیں۔ اس ساری جدت جن کے باوجود وہ کلاسیکی کی عربی کا لطف اور قرینہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ ۱۹۸۳ء میں اس ناول کے کتابی شکل میں چھپنے سے پہلے ہی یہ ہزاروں پڑھنے والوں کی دلچسپی کا مرکز بن چکا تھا۔ رباط کے ایک اخبار ''المیثاق الوطنی'' میں اس کی قسطیں سلسلے وار چھپتی رہیں۔ ان قسطوں کو پڑھنے کے بعد البقائی نے لکھا تھا ''پہلی ہی سطر سے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے لیلیٰ اور ہم پرانے دوست ہوں۔ وہ ہمارا ہاتھ تھامے ایک کہانی سنا رہی ہوں۔ ان کا اسلوب سادہ، دلکش اور پرلطف ہے۔ یہ ایسا اسلوب ہے جو لہجہ کی نرمی اور احساس کی شدت سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ احساس ایک تعلیم یافتہ اور باریک بیں خاتون کا احساس ہے۔'' کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی اور دوبارہ چھپی۔ کلاسیکی عربی کی گونج، نئی اور پرانی زبان کی گنگ جمنی کیفیت، ترجمہ پڑھنے والوں پر تو نہ کھل سکے، لیکن مناظر، بیان، زمین اور فرد کا رشتہ، روزمرہ زندگی کے واضح اور دیانتدار عکس بالکل شفاف طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ اجزاء ہیں جو کلاسیکی عربی ادب کے مزاج کا حصہ ہیں۔

اس طرح ''ابابیل'' ایک نئی طرز کا ناول ہے۔ آزاد مراکش کی ایک عورت کو اپنی آواز اور زبان ملتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صرف ایک نسائی کوشش ہے؟ ہم اس اصطلاح سے مراد کیا لیتے ہیں؟ مغرب میں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق مل جائیں۔ اس کا تعلق انفرادیت کی توثیق سے بھی ہے کہ کیا جسمانی

تفریق کو افراد کی معاشرتی حیثیت کے تعین کی میزان مقرر کر دیا جائے؟ ایک فرانسیسی سوشیالوجسٹ، جولیٹ منزالجزائر کے متعلق لکھتی ہیں "عرب دنیا میں عورتوں کی حیثیت کو کیا اسی میزان پر پرکھا جا سکتا ہے جو مغرب کی میزان ہے؟ کیا یہ یورپ کی خود پسندی نہیں ہے کہ صرف مغرب کی عورت کی زندگی کو جمہوری، انصاف پسند اور مستقبل پرست کے طور پر نمونہ بنا کر پیش کیا جائے؟ میں ایسا نہیں سوچتی۔ مغرب کی عورت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو بھی "لوگوں" کی طرح آزاد کرایا جا سکے"

یقیناً بہت سے لوگ، اپنے اپنے تہذیبی اور مذہبی پس منظر کے باوجود، آزادی کی چند بنیادی ضرورتوں پر متفق ہو جائیں گے۔ مساوی حقوق تک قانونی دسترس جیسے صحت اور دولت تک رسائی کے یکساں موقع، جبر و استبداد سے تحفظ جیسے قید، غلامی اور جسمانی تشدد کا ہدف نہ بننا۔ ان عمومی حدوں کے اندر بھی ہر تہذیب کی ہر عورت کو اپنے لئے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اور دوسری تہذیبی روایتوں کے اشتراک اور انتخاب سے اپنے لئے زندگی کا پروگرام بنا سکے۔ یہ اس کا نسائی تجربہ ہو گا۔ اس تجربے کی حتمی شکل، تصور اور اہمیتوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے، عمل کی رفتار میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔ لیکن انصاف کی طلب کے مقاصد میں کوئی اختلاف نہیں ہو گا۔ "ابابیل" عورت کی زندگی کے ان تمام مسائل کا سامنا کرتا ہے اور ان سے نبٹتا ہے۔ ناول کا آغاز زہرا کی طلاق سے ہوتا ہے۔ وہ اس احساس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ زہرا کے سامنے ایک تاریک مستقبل ہے۔ اس کا شوہر، اس کی زندگی کا واحد وسیلہ اسے رد کر چکا ہے۔ مذہب کے جو قوانین اس کی زندگی کے لئے حکم رہے ہیں اس مرحلے پر اس کے لئے کافی ثابت نہیں ہوتے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بدلتی دنیا کے تقاضوں کی خاطر عائلی قوانین اصلاح چاہتے ہیں۔ مراکش میں آزادی کے بعد سے اس ضرورت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔

یوں بے سہارا ہو کر زہرا کیا کرے؟ کس کی طرف پلٹے؟ ایک ایسے معاشرے میں جہاں والدین اولاد کی ہر مشکل میں ان کے ساتھی ہوتے ہیں، چاہے انہیں طلاق حق جائے، بیوہ ہو جائیں یا مالی پریشانیوں سے چور ہوں، وہی آڑے آتے ہیں۔ اس کے تو وہ بھی نہیں رہے۔ اپنے وطن پلٹی ہے تو ایک چھوٹا سا کمرہ اس کی ساری کائنات ہے۔

اس کے والدین کے ترکہ میں اس کا حصہ۔اس کا مزار کے عالم کے پاس جان نسائیت کے ایک مغربی علم بردار کے لئے بڑی حیران کن بات ہے۔ایسی آفت زدہ عورتوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مذہبی عالموں کے پاس غموں کا مداوا کرنے جائیں گی۔طلاق تو اسے مل گئی مگر اس لئے نہیں کہ اس کا جرم آزادہ روی،مشکل پسندی تھا، وہ تو اس لئے مسترد کی گئی کہ اپنی تہذیب کی پروردہ، روایتی عورت تھی۔وہ کانٹے سے کھانا نہیں کھاتی،فرانسیسی نہیں بولتی،مردوں سے گھلتی ملتی نہیں اور بڑی بڑی دعوتوں میں شریک نہیں ہوتی۔

تہذیبی تفریق کے باوجود، زہرا کا نصیب وہی ہے جو ایک طلاق یافتہ، جاہل اور معاشی طور پر مجبور عورت کا ہوتا ہے۔اپنی زندگی گزارنے کے لئے اسے کام کرنا چاہئے۔سر چھپانے کو آسرا چاہئے اور زندہ رہنے کو ایک وجہ چاہئے۔یہ کان نہ تو سہل ہے اور نہ خوشگوار، زہرا کی زندگی جس انداز کی گزری،اس کی کئی شکلیں ہیں۔قصبہ کی لڑکی، گوریلا مجاہد،ایک خانہ دار عورت---کسی شکل میں بھی تو اسے وہ مہارت اور تجربہ نہ مل سکا جو زندگی کے بازار میں بھنایا جاسکے۔

اس کا بہنوئی اس کا ان پڑھ ہونا اس پر واضح کرتا ہے۔وہ اسے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار ہے۔لیکن زہرا خود کو کسی کی جاگیر نہیں جانتی۔یہ اس کی آزادی کا ایک بھرپور اعلان ہے۔بہن کے اصرار میں اسے رسم رواج کی پابندی نظر آتی ہے۔لیکن اس کا سوال یہ ہے کہ کیا کسی کو اس پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا قانونی جواز میسر ہے؟ تعلقات کا دکھاوا اس بغاوت کو نہیں سہ پائے گا مگر زہرا نے اپنی زندگی خود گزارنے کا عزم کرلیا ہے۔

ناول کے خاتمہ تک زہرا کی بغاوت کی جگہ وہ اطمینان لے لیتا ہے، جو آزادی کی اصل دین ہے۔شروع کی تلخی، خفگی اور مخاصمت اب اس کے اندر نہیں۔اس نے سچ کو قبول کرلیا ہے اور اس کا سامنا کرسکتی ہے۔اس نے اس سچ کو پالیا ہے، وہ اعتراف کرتی ہے، جو محنت سے، یقین سے اور بہت ہی معمولی چیزوں سے ملتا ہے۔ایسی معمولی چیزیں جو ذکر کے قابل بھی نہیں۔یہ زندگی کو قبول کرلینا ہے پسپائیت کے احساس کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے اعتراف کے طور پر۔

یہ ناول نسائیت کے بارے میں مشکل سوال پوچھنے پر مجبور کرتا ہے۔عورتوں کی

آزادی کا ان کی سیاسی اور معاشی سرگرمیوں سے کیا تعلق ہے؟ عورتوں کا خود اپنی ہم جنسوں سے کیا رابطہ ہے؟ وہ حالات کیا ہیں جو عورتوں میں تبدیلی کا ایک نیا شعور پیدا کر رہے ہیں؟ تبدیلی کی اس فضا میں مذہب کا کردار کیا ہے؟ مذہب کیسی قوت ہے؟ وہ اصلاح کے لئے استعمال ہوتی ہے یا صرف تنقید کے لئے؟ کیا سچی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے عمل میں عورتوں کی شراکت کا دائرہ وسیع ہو؟ تاکہ دنیا کی دولت اور اس سے حاصل ہونے والی خوشی میں ان کو بھی حصہ مل سکے؟ اور آخر میں سب سے اہم اور تیکھا سوال کہ کیا زہرا نے اپنے لئے جو کچھ بھی چنا وہ صرف اس لئے چنا کہ وہ ایک عورت ہے؟

آخری سوال کا جواب ہاں میں بھی ہے اور نہیں میں بھی۔ زہرا ایک آزاد اور خود مکتفی عورت ہے۔ لیکن اس بات کو مغرب یا مشرق یا مشرق کی نسائیت کے علم بردار، دونوں ایک محدود حد تک ہی قبول کریں گی۔ زہرا کا تجربہ مغرب کے تصورات سے تو بالکل ہم آہنگ نہیں۔ وہ مغرب کی عورت نہیں ہے۔ مراکش کی عورت ہے۔ ایک مسلمان عورت، جسے اپنے مذہب سے تقویت اور سکون ملتا ہے۔ وہ ایک مختلف تاریخ کی پروردہ ہے۔ اس کی امیدیں اور آرزوئیں بھی مختلف ہیں۔ تاریخ و تہذیب کا یہ فرق لیلیٰ ابوزید نے بڑی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔ زہرا کی آزادی کے مسئلہ کو مصنفہ نے ملک کی آزادی اور اس کے مسئلوں کے تانے بانے میں چابک دستی سے بن دیا ہے ایک عورت کا تجربہ، ایک معاشرے کا استعارہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو مغرب کی بزم خیال کے لئے اجنبی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جماعت کو جس قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، یہاں اس کا بھی عکس نہیں۔ یہ ناول کوئی نظریاتی منشور نہیں۔ ایک جیتی جاگتی عورت کی دھڑکتی زندگی کے تجربوں کا بیان ہے۔ لہجہ کہانی کا ہے۔ قصہ خیالی نہیں۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر تمام نظریوں کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔

''ابابیل'' مراکش کی خواتین کی مخصوص صورت حال کا باریک بینی اور دروں بینی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس واقعاتی حقیقتیں، علامتیں بن جاتی ہیں۔ مراکشی خاتون کے قلم سے لکھا ہوا قومی زبان میں پہلا ناول۔ اس لئے بھی پہلا کہ صرف یہی انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ یہ باتیں مراکشی ادب کی نئی جہتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ خاص طور پر اپنی زبان کو اپنے تشخص کا پیمانہ جاننا۔ اس نے ادب میں ایک ایسی تحریک پیدا کر دی کہ مردوں

اور عورتوں کی ایک کثیر تعدا نے اس میں شرکت کی مراکش کی جد و جہد آزادی کے پس منظر میں یہ ناول منفرد مقام رکھتا ہے۔اس نے تاریخ کو سنجیدگی سے اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ نہ حب الوطنی کے بلند بانگ دعوے، نہ اپنی مدافعت میں جملہ ہائے اعتذار۔لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ مصنفہ کو اپنے ملک کی کاوشوں پر ناز نہیں۔حقیقتوں کا ایک گہرا شعور ہر سطح پر موجود ہے اور یہ اعتراف بھی کہ قوموں اور لوگوں کے مسائل کا کوئی آسان حل نہیں ہے۔انہیں اس کا اندازہ ہے کہ معجزے بازار میں نہیں بکتے اور نہ صرف آزاد ہو جانے سے ہر دکھ کا مرہم ہاتھ آتا ہے۔دوسروں کے تسلط سے سیاسی طور پر آزاد ہو جانا منزل نہیں ہے۔منزل کی طور پیش قدمی کا موقع ہے۔صرف یہاں ہی مطمئن ہو جانے سے زندگی کے بند دروازوں کا سم سم نہیں کھلتا۔

یہ سچائیاں، سیاسی ہوں، معاشی ہوں یا لسانی اور تہذیبی۔ یہ وہ ٹکڑے ہیں جن سے مل کر بیسویں صدی کے مراکش کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔مراکش کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ صرف ایک ملک کے نہیں ہیں، بہت سے دوسرے بھی اس کی طرح ،اسی گنجلک میں ہیں۔ جہاں عوامل میں تو کچھ فرق نہیں، بس فکر و خیال کے زاویے، پیکر مختلف تراشتے ہیں۔

عارفہ سیدہ زہرا

پہلا باب

میں اپنے شہر واپس لوٹ رہی ہوں۔ بے بس اور بکھری ہوئی۔کل تک بے چینی مجھے مارے ڈالتی تھی۔آج مایوسی اس سے زیادہ ابتلا میں رکھے ہوئے ہے۔ مجھے یقین کی تلاش تھی لیکن جب میں نے اسے پایا تو اس نے مجھے کنارے سے اٹھا کر اتھاہ اکیلے پن میں پھینک دیا۔کل جیسے برسوں کی بات ہو۔سامنے ایک پوری لمبی زندگی اور ہے۔ چالیس سال مجھے تلخی کا خوف دے گئے ہیں۔ میں چالیس کہتی ہوں شاید اس سے زیادہ ہوں۔ مجھے تو سو لگتے ہیں۔جس سے شادی ہوئی اس آدمی کو جانے پرکھے بغیر میں جیتی رہی۔ وہ شخص جسے میں کل تک بھی نہیں جان سکی۔اب میں پھر اپنے گھر واپس آ گئی ہو۔اجنبیوں کے درمیان ایک اور اجنبی۔ جب یہاں سے رخصت ہوئی تھی تو بیس سال سے کم کی رہی ہوں گی۔اپنی ماں کے مرنے کے بعد سے پھر کبھی آئی بھی نہیں۔کس کے لئے آتی میں پلٹ کر!

یہ شہر میرا گھر، میرے ذہن میں کہیں دبا چھپا رہا۔جس طرح سرکاری کاغذ جو ضرورت پڑنے تک یاد سے محو رہتے ہیں۔ جیسے ہی اس نے کہا'' تمہارے کاغذات اور جو کچھ تمہارا حق ہے، تمہیں پہنچا دیا جائے گا''۔اسی گھڑی مجھے یہ شہر یاد آ گیا۔اپنی اپنی فکروں میں گھرے بس کے دوسرے مسافروں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ میں اب کیا کروں گی! میں نے آزاد ہونے والے قیدیوں کا واپس بندی خانوں کو پلٹنے کا ذکر سنا ہے۔اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔قسمت کو جانے کیا منظور ہو، لیکن میں اب اپنے قدموں کے نشان نہیں ڈھونڈ پاؤں گی بہر حال، نہ تو میں خوفزدہ ہوں اور نہ ہی بدلہ لینے کی خواہش میرے اندر ہے۔ میرے اندر نہ دکھ ہے نہ نفرت۔ کچھ بھی نہیں سوائے ایک مبہم سے آگاہی کے۔ جیسے میرے اندر کچھ بجھ سا گیا ہے، کچھ رک سا گیا ہے۔ پھر بھی میں سوتی اور جاگتی رہی ہوں۔زندہ اور مردہ کے درمیان روح حد فاصل ہے۔کاش مجھے بھی جڑ سے اکھاڑ دیا گیا ہوتا۔موت کا خیال مجھے اچھا لگتا ہے مگر مجھے مرنے سے ڈر لگتا ہے۔ہم

زندگی سے کس طرح چمٹے رہتے ہیں۔ ہے نا عجیب بات۔

''تمہارے کاغذات اور جو کچھ تمہارا قانونی حق ہے تمہیں بھجوا دیا جائے گا''۔

میرے کاغذ؟ عورت کیسی بے توقیر چیز ہے۔ جسے دکان سے خریدی ہوئی چیز کی طرح رسید کے ساتھ واپس کیا جا سکتا ہے۔ کس قدر بے قیمت!

ان چند لمحوں نے میرے وجود کو ختم کر ڈالا۔ ہر اس چیز کو جس پر میں یقین رکھتی تھی۔ میرا منہ لٹ گیا اور میں اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''کیوں''؟

''میرے پاس اس کی کوئی وجہ نہیں''۔

اس نے کار کی چابیاں اٹھائیں اور خاموشی سے گھر سے باہر چلا گیا۔ مجھے اپنا بے ہوش ہونا یاد نہیں، لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میرا جسم اکڑا ہوا تھا اور کسی لاش کی طرح میرے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔ جس طرح کئی سال پہلے اس دن جب دروازے کی دستک پر اک اجنبی کو اپنے سامنے پایا تھا جس نے الجزائری لہجے میں مجھ سے کہا ''انہوں نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔''

یہ قیامت بھی مجھ پر کب ٹوٹی ہے، جب میرا سارا خاندان شہر کے قبرستان میں مکین ہے۔ کیا کروں گی میں؟

بس کی کھڑکی سے میں طوفان کا اندازہ لگایا اور اس کے سارے نشانات دیکھے۔ سڑک پر جھونپڑیوں کے ملبے کے بیچوں بیچ جڑ سے اکھڑے پڑے تھے۔ اس منظر نے سات سال پہلے کے سیلاب کی یاد تازہ کر دی، جس میں شہر کی ہر چیز بہہ گئی اور بس کھنڈر رہ گئے تھے۔ سیلاب اور طوفان جس طرح تباہی مچاتے ہیں وہی نئے سرے سے شہر بسانے کو کافی ہے۔ جیسے کسی نے میرا کلیجہ پکڑ لیا۔ یہ طوفان تو ایک بڑی تباہی کی تنبیہہ تھی لیکن مجھے اس کی فکر بھی نہیں تھی۔

شہر کے دروازے پر مسافر اترتے جاتے ہیں اور اوجھل ہوتے جاتے ہیں۔ صرف ہوا کی آواز باقی ہے۔ پرانا قہوہ خانہ خالی پڑا ہے۔ کافی عرصہ سے اس کا ایسا ہی حال ہے۔ کرسیاں میزوں پر اوندھی رکھی ہیں۔ غربت اور سردی نے اس کے خلاف سازش کی رکھی ہے، لیکن یہ بھی شہر والوں کی طرح موت سے مزاحم کھڑا ہے۔

نم زمین اور گوبر کی ملی جلی شہر کی خوشبو سونگھتی میں چوک سے گزر آئی ہوں۔ دروازے میں داخل ہوگئی ہوں۔پچھلے برسوں میں یہاں سے گزرتے ہوئے ایک عجیب سرخوشی سی ہوتی تھی،لیکن اب شہر کی فصیل سے پرے دریا کے کنارے محرابی کھڑکیوں والے خستہ حال مکانوں پرنظر ڈالتے ہوئے مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔کیا میں نے اپنا تشخص کھو دیا۔

سیلاب نے دریا کے کنارے گہرے کاٹ دیئے تھے،مگر پانی کا بہاؤ کم ہی تھا۔بچے کھچے بہتے پانی کی آواز شہر کی گندی گلیوں اور گرتی دیواروں کے پس منظر میں بڑی اکیلی اور عجیب معلوم ہوئی ۔اکا دکا دکانیں ہیں۔ایک کوئلے والے کی ٹال ،درزی اور پنساری کی تقریباً خالی دوکان۔یہودیوں کی بھری پڑی دوکانوں پر مضبوط تالے لگے ہیں۔پہلے ان کے اسکول تھے،عبادت گاہیں تھیں۔لیکن جب وہ گئے تو کاروبار مندا ہوگیا اور قیمتیں گر گئیں۔وہ تجارت کرتے تھے۔بیئر بیچتے تھے کچھ جادوٹونے کا کاروبار تھا اور پھر گروہ در گروہ وہ کہیں اور چلے گئے۔کشتیاں انہیں طنجہ سے بھر بھر کے لے گئیں صرف ان کے ہیولے شہر میں گشت کرنے کو رہ گئے۔

ایک تصویر میرے ذہن میں در آتی ہے۔درمیانے قد،مضبوط کاٹھی کی ایک عورت۔جس کے شانوں پر ایک شال چوڑی سی تکون کی شکل میں پڑی رہتی۔اس کے گرد ریشم کے پھندنے تھے۔جیسے کہ Flamenco ہسپانوی رقاصاؤں کے ہوتے ہیں۔تیس پینتیس سال پہلے کا تصور۔یہودی عورتیں رحمہ کے دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی رہتی تھیں۔

میں جب بھی اپنی گلی میں نکلتی کوئی نہ کوئی یہودی عورت رحمہ کے دروازے پر موجود ہوتی۔کچھ عجیب مضبوط سا رشتہ تھا اس کے اور ان عورتوں کے درمیان۔وہ ان کے لئے فال نکالتی،عورتیں نذرانے گزارتیں ہاتھ چومتیں اور دعائیں دیتی واپس ہو جاتیں۔ شاید اب یہ مشغلہ سودمند نہیں رہا تھا اور اس نے خود کو اپنے گھر کے اندھیرے میں پابند کرلیا تھا۔

چاہے میں ان گلی کوچوں کی سب شکلوں کو بھول جاؤں لیکن میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتی۔اس کی یادیں بڑی روشن ہیں۔جس دن سے میں نے ہوش سنبھالا، میں نے

اسے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ میرے تخیل پر اس کے تصور کی گرفت بڑھتی جاتی تھی ۔ وہ ایک بڑا پیکر تھی ۔ ہر اس چیز سے ماورا جس کا ادراک ذہن کر سکتا ہے ۔اس کے بال ،مہندی سے بار بار رنگے جانے کے بعد سرخ تھے اور وہ سر پر ہمیشہ ایک پیلی اوڑھنی لپیٹے رہتی تھی ۔اس کی لٹوں کے ساتھ ریشم کے تار بھی کناروں پر چمکتے رہتے تھے ۔اس کی آواز تیز ،لہجہ تند تھا اور اپنے مخالفوں کو گالیوں سے اس طرح پسپا کر سکتی تھی جیسے کوئی پہلوان اپنے مکوں سے ۔

اس کا دن اپنے دروازے کی دہلیز پر بیٹھے گزرتا ۔سردیوں میں ایک کمبل اپنی ٹانگوں پر لپیٹ لیتی ۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنی بات بتائے بغیر گلی سے گزر جاتا ۔ دو آدمی اگر بات کرنے کو ٹھہرتے تو ممکن نہ تھا کہ وہ اس میں شریک نہ ہو ۔ وہ شہر کی ہر عورت سے مختلف عورت تھی ۔اس کا چرچا میدانوں سے لے کر پہاڑوں تک تھا ۔اس کے ذہن میں رازوں اور سکینڈلوں کا ایک وافر ذخیرہ تھا -- ذرا ہوا اس کے خلاف پلٹی اور اس نے بوچھاڑ شروع کی ۔ رحمہ کی اگر کسی سے لڑائی ہو جاتی ،تو محلے کی ساری عورتیں دروازوں اور چھتوں کا رخ کرتیں ۔ راہ گیر رک جاتے اور گلی میں سرکس کا سا سماں ہو جاتا ۔

وہ کسی بات سے پریشان نہیں ہوتی تھی ۔سوائے اس کے کہ اگر یہ مسئلہ چھڑ جائے کہ آخر وہ آئی کہاں سے؟ کون ہے وہ؟ یہاں تک کیسے پہنچی؟ مجھے اپنی زندگی میں تو کوئی ایسا نہ ملا جسے اس کے متعلق کچھ بھی اتا پتا ہو ۔ یہ ایک ایسا راز تھا جسے صرف وہی جانتی تھی یہ راز قبر تک اس کے ساتھ جائے گا ۔

ان سوالوں کا جواب نہ ملنے پر اس کے پر اسرار ہونے کی کیفیت بڑھتی اور افواہوں کے لئے فضا اور ساز گار ہو جاتی ۔ جادوگرنی تھی ۔ جاسوس تھی ۔ضرور اس کا کوئی نہ کوئی ماضی تھا ۔اس طرح کی باتوں سے وہ صرف رنجیدہ ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے لئے جنگ کے ماحول کی کشیدگی اپنی جگہ رہتی اور صلح کی ہر پیش قدمی بے نتیجہ رہتی ۔اس طرح اس کے کھلے دروازے سے مغلظات کا ایک نغمہ چھڑا رہتا جو اس کے حریفوں کو نیزے کی انی کی طرح چبھتا ۔

اپنے والدین کی باتیں سن سن کر ہم سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے گھر میں جادو کی ایک کوٹھڑی ہے جس میں وہ شریر بچوں کو بند کر دیتی ہے اور کوٹھڑی کے دروازے

سے شہر کے دروازے تک ایک سرنگ ہے جو آخر کار ایک بھیانک تہہ خانے تک جاتی ہے۔

ایک دن اس کی لڑائی میری اماں سے ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کر برا بھلا کہا، رحمہ کا چوڑا چکلا وجود اس کے گھر کے دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی، اس نے میری چھوٹی بہن کو چھپا لیا۔ وہ اپنے دروازے کی مچان میں سے بچی کو تلاش کرتے ہمیں دیکھتی رہی۔ ہاں جان بوجھ کر وہ اپنی چھڑی سے ٹک ٹک کئے جاتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میرے خیالوں کے پروں پر اس عورت کا تصور پھیلتا گیا۔ میں تو ان پروں پر اڑ جانا چاہتی تھی۔ وہ مجھے ہکا بکا کر دیتی۔ اس کا جادو مجھ پر اس طرح چلتا اور میں اس کی طرف یوں کھنچتی جیسے پروانہ شمع کی طرف جاتا ہے۔ میں نے عہد کیا کہ اس کی راجدھانی اور رازوں میں کسی طرح سیندھ لگانا چاہئے۔ میں نے اس کی بیٹی سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ مجھ سے ذرا چھوٹی۔ جسے وہ اپنی اولاد کہتی تھی لیکن ہم میں سے کوئی یہ بات نہیں مانتا تھا۔ اس کی بیٹی اور اس کی چھڑی دو چیزیں اس کے دم کے ساتھ تھیں۔ چلتے وقت وہ اپنا وزن کبھی ایک اور کبھی دوسری پر ڈال کر چلتی۔ جب وہ دم لینے کو ذرا کی ذرا ٹھہرتی تو جیسے پوری سڑک پتھرا جاتی۔

میں نے اس لڑکی سے دوستی کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ آخر کار جب ایک دن رحمہ نے مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ کیڑی کاڑا کھیلنے کو بلایا تو میں فوراً راضی ہوگئی۔ وہ ہم دونوں کو کھیلتے دیکھتی رہی، اس وقت ہم گلی کے بیچوں بیچ ایک خانے سے دوسرے خانے میں کود رہے تھے۔ کچھ دن گزرے تو تعلقات اتنے استوار ہوئے کہ مجھے گھر کے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

باقی بچے مجھے آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے جب میں دروازے سے اس کے گھر میں داخل ہوتی۔ میں انجانے خوف اور رعب کے مارے دم بخود تھی اور اس طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی جیسے ڈراؤنی فلم دیکھنے جاتے ہوں اور یہ خبر بھی ہو کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ میں نے ایک تیز اور بھرپور نظر سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہاں چند مٹکے رکھے تھے۔ بہت سے دروازے تھے جن پر تالا پڑا تھا۔ ایک بڑا سا صحن تھا جس کے بیچوں بیچ انجیر کا ایک پیڑ تھا اور پیڑ کے تنے میں سرکنڈوں کی گڑیاں چھوٹے چھوٹے گدوں پر رکھی ہوئی

تھیں۔

گڑیوں کی ساری کشش کے باوجود میری توجہ بند دروازوں پر تھی۔ایک عجیب پراسراری سی خاموشی، ویرانی اور خدا جانے ان مشکوں میں کیا تھا؟ اچانک ایک بند دروازے کے پیچھے ایک عجیب سی سرسراہٹ ہوئی۔ جیسے کوئی بھوسے پر چل رہا ہو۔میری ساری حس اس آواز پر مرکوز ہو گئی اور میں نے اپنے تصور میں ایک عجیب الخلقت، دم،سینگوں،کھروں والے ڈراؤنی انسان نما مخلوق کو وہاں گھومتے دیکھا۔میں نے خود کو یقین دلانے کی بڑی کوشش کی کہ وہاں گھر کے مویشیوں میں سے کوئی ہو گا،شاید کوئی بکری ہی ہو،لیکن میرا شک اتنا گہرا اور شدید تھا کہ ایسی معمولی بات میرا ذہن آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں تھا اور میں نے اپنے پہلے تصور ہی کو بہتر جانا۔

بچوں میں تخیل کی قوت بہت ہوتی ہے اور اتنی ہی یہ آمادگی کو وہ تصوراتی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں بڑھے گی۔جس طرح اس کی اماں اس پر لدی رہتی ہیں یہ ایک انچ نہیں بڑھ سکتی۔ بچے اس طرح کہا کرتے اور میں مان لیا کرتی۔اس کے باوجود جب میں کیسابلانکا سے رخصت ہوئی تو رحمہ کی بیٹی ایک بڑی دلنواز، پرکشش نوجوان عورت تھی۔جس کے چمکدار بالوں کی لمبی چوٹیاں اس کی کمر پر جھولتی رہتیں اور وہ اور بھی حسین نظر آتی۔

آزادی کے بعد جب میں رباط میں رہتی تھی۔ایک دفعہ شب قدر میں پرانے شہر میں شیوخ امام کے روضوں کی زیارت کو گئی۔میں بھیڑ میں اپنا راستہ بناتی جا رہی تھی۔اس ہجوم میں وہ بچے بچیاں بھی تھے جن کی پہلی روزہ کشائی تھی۔ بچیاں خوب سجی بنی تھی اور ان کے چہرے اس طرح لیپے پتے تھے کہ وہ سفید کپڑوں میں لپٹی چھوٹی چھوٹی گڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔چھوٹے چھوٹے بچے قہوہ خانوں کے گردا گرد منڈلا رہے تھے کہ شاید کوئی ان سے جوتے پالش کروالے۔کچھ بچوں نے مزاروں پر بتیاں بیچنے کا عارضی کاروبار ڈھونڈ لیا تھا۔وہ ہر زائر کی جان کو آجاتے۔حتیٰ کہ وہ ان کو جھڑکتے اور پھر وہ کسی دوسرے شکار کو تاکتے۔

ایک لمبے سے دالان میں جو چیونٹیوں کی طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا،میری نظر بھکاریوں کی ایک ٹولی پر گئی۔ان کے حمد یہ گانے فاصلے باوجود صاف سنائی دے رہے

تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس بھیڑ بھڑ کے میں، میں نے رحمہ کی بیٹی کو گود میں بچہ اٹھائے دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ بال دھول میں اٹے ہوئے تھے اور اس کے بازو اس قدر سوکھے ہوئے تھے کہ میں نے اتنا دبلا پن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اچانک اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہماری نظریں چار ہو گئیں۔ میں ڈر کے مارے سہم گئی لیکن بھیڑ کے دھکوں نے مجھ اس سے اور پرے دھکیل دیا اور میں نے خود کو ایک مزار کے صحن میں پایا۔ وہ سوکھے بازو اور اجڑی سی آنکھیں میرے ذہن میں کندہ ہو کر رہ گئیں۔ کیا ہو گیا اسے؟ مانا کہ آج عورتوں کو ہر طرح کے دکھ سہنا پڑتے ہیں لیکن آخر ایسا کیا ہوا جس نے اُسے اس حال تک پہنچا دیا۔

مجھے وسوسوں اور ایک طرح کی خفت نے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ مجھے دوبارہ اس کا سامنا کرتے ڈر لگ رہا تھا۔ میں مزار کے صحن میں اس وقت تک ٹھہری رہی جب تک مجھ میں وہاں سے چلنے کی ہمت نہ آ گئی۔

جب میں وہاں سے باہر نکلی تو وہ اس جگہ نہیں تھی اور نہ ہی کہیں اور دکھائی دے رہی تھی یہ ممکن بھی نہ تھا کہ اس آفت کی بھیڑ میں میرا اس کا دوبارہ آمنا سامنا ہو جاتا۔ اس رات کے بعد سے میں جب بھی پرانے شہر جاتی۔ اس کی تلاش میں رہتی، لیکن وہ مجھے پھر کبھی نظر نہیں آئی۔

اس گھڑی رحمہ کا گھر میرے سامنے ہے۔ گلی کا آدھا راستہ گزار کر سیدھے ہاتھ کو لوہے کے دروازے پر تالا پڑا ہے؟ کیا وہ اس دنیا سے کوچ کر گئی اور ہمارا گھر ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا؟ شروع سے ہی یہ گھر ہم نے آپس میں بانٹ لیا تھا اور جب ہم سب یہاں سے چلے گئے تو کمرے کرایہ پر اٹھا دیئے تھے۔ میں گھر میں داخل ہوتی ہوں تو صحن کے چاروں طرف کمروں کے دروازے بند ہیں۔ جیسے ہمیشہ سے خزاں کے آتے ہی سردی سے بچنے کے لئے ہم یہ دروازے بند کر لیا کرتے تھے۔

میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اس کی مکین کو جگا دیا۔ میں نے جیسے ہی نقاب اٹھائی اس نے مجھے پہچان لیا اور کچھ رود قدوح کے بعد اس نے مجھے کمرے میں آنے کی اجازت دے دی۔ کمرے کے عسرت نے میری عاجزی کو اور جگا دیا ہے۔ میں اس ادھیڑ بن میں ہوں کہ اسے کس طرح یہ بتاؤں کہ میں کیوں آئی ہوں۔ میری

ہچکچاہٹ نے اس کی بے چینی کو بڑھا دیا ہے۔لگتا ہے اس نے بری خبر کا اندازہ لگا لیا ہے اور آخر کار جب میں اسے یہ بتاتی ہوں کہ یہ کمرہ مجھے واپس چاہئے تو وہ حیران نہیں ہوتی۔اس کا یہ خیال ہے کہ میں اسے پوری بات نہیں بتا رہی ہوں۔کچھ نہ کچھ ضرور چھپا رہی ہوں۔یہ بات میں برسوں سے جان گئی ہوں کہ آپ کسی کو بھی توجیہات سے قائل نہیں کر سکتے۔اس لئے میں اسے دوٹوک بات بتا دیتی ہوں۔اس میں مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا۔''مجھے طلاق مل گئی ہے اور میرے پاس اس کمرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔مگر کچھ کہتی نہیں۔ہم لوگوں کے لئے طلاق تو ایک آفت ہے۔تباہی اور صرف تباہی۔اگر اسے کچھ اعتراض ہوتا بھی تو اس دوٹوک بات کے بعد کہنے ہی کو کیا رہ گیا تھا۔

''میں چلی جاؤں گی۔''

میں نے زیرلب شکریے کے الفاظ کہے ہیں۔وہ بہت ضد کرتی ہے کہ میں ایک پیالہ چائے پی لوں۔لیکن میں جانتی ہوں ایک غریب عورت کے لئے ایک پیالہ چائے کے کیا معنی ہوتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ مجھے رات بسر کرنے کے لئے جگہ ڈھونڈھنا ہے۔وہ دروازے تک مجھے چھوڑنے آتی ہے اور میں وہاں سے بمشکل چل پاتی ہوں جیسے مجھے کوئی معذوری ہو۔

کیچڑ،گوبر،کھنڈر،جانور اور ایک خاکروب،جس کے گدھے پر گندگی لدی ہوئی ہے اور وہ مزمار بجا رہا ہے۔تاریخ میں ڈوبا ایک شہر جس کی نئی بات صرف بجلی کے تار اور چاروں طرف بکھرے ہوئے پلاسٹک کے تھیلے ہیں۔میں گنبد والے سفید مزار تک جا پہنچی ہوں۔میرے جوتے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں۔میں انہیں جھٹک کر صاف کیا ہے۔انہیں اپنے ساتھ اندر لے جاتی ہوں۔فقیہ کونے میں بیٹھا ہے اور ایک انگیٹھی اسے گرمائے ہوئے ہیں۔وہ اتنا ہی بوڑھا ہے جتنا پرانا ہمارا گھر۔اسے دیکھتے ہی مجھے اطمینان سا ہو جاتا ہے۔مجھے ڈر تو یہ تھا کہ کہیں رحمہ کی طرح وہ بھی دار فانی سے کوچ نہ کر گیا ہو لیکن وہ تو ذرہ بھر بھی نہیں بدلا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اس کی دنیا میں وقت نام کی کوئی چیز نہیں یا شاید کچھ بدل بھی گیا ہو۔اس کی داڑھی پہلے سے زیادہ سفید ہوگئی ہے۔میں نے اس کا

ہاتھ تھام کر بوسہ دیا ہے اور ان ہاتھوں کی نرمی اور گرمی محسوس کی ہے۔اس نے نظر اٹھا کر دیکھا نہیں ۔ میں بیٹھ جاتی ہوں اور صف کا ایک کونا اٹھا کر اپنے جوتے اس کے نیچے کھسکا دیتی ہوں اس کا جسم لاغر، صاف ستھرا ہے سر پر بڑا سا صافہ ہے اور اس کی عبا بے داغ ہے۔ ضعیفی کی پُروقار کشش اس میں موجود ہے۔کیا عمر ہے اس کی ستر، اسی؟ یا اس سے بھی زیادہ؟ لیکن یہ بات تو ہم اپنے بچپن میں بھی کہا کرتے تھے جب میری نانی زندہ تھیں۔خدا بخشے وہ اس کی مرید تھیں۔تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں اس کی اور ایسا ڈوب کر ذکر کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں کہ اکثر ان پر مستی طاری ہو جاتی۔ جب ذکر کی مجلس نہ ہوتی تو وہ نالاں اور گریاں رہا کرتیں۔وہ جب بھی پیر صاحب کے پاس جاتیں۔ مجھے ساتھ لے جاتیں۔لیکن وہاں جانے میں مجھے خوف اور تامل ہوتا اور پھر وہ برقعے سے چہرہ چھپا لیتیں۔اس حالت میں یہ عورتیں یوں معلوم ہوتیں جیسے گلیوں میں سفید خیمے چل پھر رہے ہوں۔جیسے ہی ہم نکڑ پر پھل والے تک پہنچتے، خوف میرے دل میں در آتا عجب طرح سے وہ پھل والا اور خوف میرے ذہن میں جوان ہونے تک ایک دوسرے سے نتھی رہے۔

شیخ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں اور میں انہیں تکتی رہتی ہوں۔میرے اندر اتنی بے چینی ہے کہ مجھے لگتا ہے میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ کہہ نہیں پاتی۔لفظ اتنے ناکافی کیوں ہوتے؟ دیوار پر ایک بڑے سے کارڈ پر جلی حروف میں اللہ کا نام لکھا ہوا ہے۔رنگین شیشے کا ایک فانوس سجاوٹ کے طور پر چھت سے لٹکا ہوا ہے۔ میں شیخ کو اپنے بربری لہجہ میں دھیرے دھیرے پڑھتے سن رہی ہوں۔ایک عمر شہر میں گزارنے اور قرآن حفظ کرنے کے باوجود یہ لہجہ ذرہ بھر بھی تو بہتر نہیں ہوا۔

''اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جان کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باوجود اپنی فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی---'' (سورہ توبہ۔آیت ۱۱۸)

لفظوں کی بلاغت کا تحیر مجھے پتھرا دیتا ہے۔یہی کچھ تو میں بھی کہنا چاہ رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی۔ایسا لگتا ہے کہ کلام کی مخاطب میں ہوں۔ شیخ خاموش ہوتے ہیں اور میں کہتی ہوں ''حضور، مجھے یہاں رات گزار لینے کی اجازت ہے؟'' میں شیخ کو ان کے نام سے مخاطب کرنا چاہتی ہوں، مگر مجھے ان کا نام یاد ہی نہیں۔ وہ نظر اٹھا کر مجھے دیکھتے

ہیں۔ان کے چہرے سے ان کی نیک طینت ظاہر ہے۔

''تمہارے پاس کوئی اور جگہ نہیں؟''

''اس جگہ کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں؟ آج مجھے طلاق دے دی گئی''۔

ان کا چہرہ جیسے دھندلا سا گیا ہے۔اور یہ لفظ جیسے مجھے بھی جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔کیسی عجیب بات ہے لفظوں کا زہر ابھی تک باقی ہے۔بے بسی اور دکھ کا ایک احساس میرے سینے سے اٹھ کر میرے گلے میں پھنس جاتا ہے اور آنسو چہرے پر بہنے لگتے ہیں۔

''مت روؤ''

مجھے اور زیادہ رونا آتا ہے یہاں تک کہ میری ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔مجھے اپنی زندگی اور اپنے ہی شہر میں اجنبی ہونے کا احساس رلا رہا ہے۔میں اپنے آنسو خشک کرتی ہوں۔ناک پونچھتی ہوں۔

''تم بالکل یہاں والوں کی طرح بولتی ہو۔اب اسے چھپانے کی کوشش مت کرو''۔یہ بات ٹھیک ہے۔مچھلی کی بساندھ کی طرح یہ مجھ میں بسا ہوا ہے۔میرا لہجہ اور میرا کمرہ دو ہی چیزیں تو مجھے اس شہر نے دی ہیں۔

''تو حضور آپ نے مجھے پہچانا نہیں''۔

''نہیں،کیوں؟''

''میں زہرا ہوں۔کنزہ کی نواسی۔وہ مرتے دم تک آپ کے پاس آتی رہیں''۔

خوشی سے ان کا چہرہ چمک اٹھتا ہے اور ساتھ ساتھ اس بات سے حیران بھی ہیں کہ کیا کوئی اس حد تک بھی بدل سکتا ہے۔

''قسمت نے ان حالوں کر دیا''۔وہ ایک آہ بھر کر کہتے ہیں۔

''نہیں۔آزادی نے ان حالوں تک پہنچایا''۔میں ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہوں۔

''لیکن کیوں''؟

میرے اندر غصے کا لاوا ابلتا ہے اور میں تند و تلخ لہجہ میں کہتی ہوں۔

''میں چھری کانٹے سے نہیں کھاتی۔فرانسیسی نہیں بولتی مردوں سے ملتی جلتی نہیں۔عالی شان ضیافتوں میں نہیں جاتی۔اتنا کافی ہے یا کچھ اور بتاؤں''؟

''ان کے معیار یہ ہیں''۔

''میری حیثیت پرانے سکے سے زیادہ کی نہیں جو صرف عجائب خانوں میں سجتا ہے۔اب معاشرے میں ان کی جو حیثیت ہے وہاں صرف نئے فیشن کی عورتیں زیب دیتی ہیں''۔

وہ میری باتیں اس طرح سنتے ہیں جیسے میں مریخ سے آئی ہوں۔

''انسان کے اثاثہ میں سب سے نازک چیز اصول ہیں''۔وہ زیرلب کہتے ہیں۔

''لوگ کیسی آسانی سے سب کچھ بھول جاتے ہیں''۔

''ہرکوئی بھول جاتا ہے۔خود قوم بھول جاتی ہے''۔

''تو تمہارے پاس کچھ بھی نہیں''؟ وہ مجھ سے سوال کرتے ہیں۔

''اپنے باپ کے گھر میں ایک کمرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔جو جلدی خالی ہو جائے گا۔یا پھر تین مہینہ دس دن کی عدت کی گزران کا خرچ''۔

''تمہارے رشتہ دار تو اس شہر میں بہت ہیں''۔

''صرف دور کے۔جن سے میں سالوں سے نہیں ملی۔سو اب اس سے کیا فائدہ۔

مجھے معلوم ہے وہ کیا کہیں گے۔کہیں گے کہ تم تو ایسی گئیں، کہ اب تو ہم تم کو بھول ہی گئے۔تم نے ایسا کیوں کیا؟ بہت رنج پہنچایا تم نے ہم کو---نہیں میں اب ان میں سے کسی سے نہیں ملوں گی''۔

''تمہارے جیسے حالات میں عورتوں کے لئے تنہا رہنا مشکل ہے؟''

''مجھے سب برے لگتے ہیں۔اپنی ذات سمیت۔مجھ اپنے چاروں طرف ایک بے کسی اور مجبوری کا حصار لگتا ہے۔یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا کسی نے جادو کر دیا ہے مجھ پر؟''

''ذرا سنبھل کر بات کرو۔یہ معاملے نازک ہوتے ہیں''۔

''لیکن نبی کریمؐ پر بھی تو جادو کیا گیا تھا''۔

''صلی اللہ علیہ وسلم''

''آپ کو تو یہ بات معلوم ہے نا''۔

''اور جادوگر کہیں بھی جائے، کامیاب نہیں ہوتا---''''سورہ طہ، آیت ۲۹''

''کم از کم نظر بد تو ہے ہی''۔

''واللہ اعلم''

''اللہ کیا لوگوں کو ذلیل کرتا ہے''۔
وہ تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے پھر مشغول ہو جاتے ہیں۔
'' درود کا ورد رنج وغم کو کم کرتا ہے اور روح اس طرح صاف کر دیتا ہے جیسے میل کچیل کٹ جائے تو صاف لباس''۔
'' اور ہمارملک غلاظت میں ڈوبا ہوا ہے''۔
'' لیکن تمام نیکی تو ختم نہیں ہوئی۔اگر کہیں ایسا ہوا تو اب تک غیض وغضب ہم سب کو نگل گیا ہوتا''۔
''کیا ہم سب نگلے نہیں جا چکے؟ زندگی کا سارا مزہ ہی جاتا رہا۔لگتا ہے ہم رنج و مصیبت کی فضا میں سانس لیتے ہیں''۔
''رنج ہمیشہ نہیں رہتا''۔
''لیکن میرا جینا مرنا تو اس کے ساتھ ہی ہے۔مرد تو شراب پی کر غم غلط کر لیتے ہیں۔میں بقید ہوش وحواس اس کا مقابلہ کروں گی''۔
''سو خوش ہو جاؤ۔صبر تو ایمان کی نشانی ہے''۔
''اس کے بغیر تو میرا دماغ خراب ہو جاتا''۔
'' یہ سب چیزیں گزر جانے والی ہیں۔اس کا انعام ہمیں اگلے جہان میں ملے گا''۔
''یہ تو عارضی ہے اور دوسرا عالم برحق ہے۔بس ہمیں اللہ پر ایمان رکھنا چاہئے۔
یہاں ہماری بات چیت ختم ہوئی۔ وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ذرا دیر میں وہ مٹی کے آبخورے میں پانی ، جو کی روٹی اور ایک پڑیا میں لپٹے کچھ زیتون لے کر پلٹے۔ہم دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔پھر انہوں نے مجھے ایک کمبل اور گدا لا کر دیا، شب بخیر کہا اور چلے گئے۔
دن بھر کی تھکن نے مجھے ندھال کر دیا تھا۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ میں لیٹتے ہی سو گئی تھی ،لیکن صبح کو جب جاگی تو انگور کے پتوں پر گرتی بارش کی بوندوں کی آواز ذہن میں تازہ تھی یوں لگا کہ آواز جیسے میرے بچپن کی ہو۔
میں دوپہر ڈھلے تک مقبرے میں رہی اور پھر میں نے سوچا کے اس عورت کو

دیکھوں۔ یہودیوں کے چلے جانے سے اسے دوسری جگہ ڈھونڈھنے میں مشکل نہیں ہوگی۔

ہماری گلی کے سرے پر کچھ لڑکیاں رسی کود رہی تھیں اور کچھ گود میں بچے اٹھائے تھی غربت باوجود ان کی صحت اچھی تھی اور ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ میں سوچتی ہوں انہیں دودھ خوب ملتا ہوگا پینے کو۔ یہاں کے لوگوں میں یہ دستور ہے کہ اپنے مویشی پہاڑوں پر بھیج دیتے ہیں لیکن ایک گائے اپنے استعمال کے لئے گھر میں رہنے دیتے ہیں۔ کچھ دودھ ان کے گھروں میں خرچ ہو جاتا ہے۔غریبوں کے اچھے نصیب باقی ان میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

میں بچیوں کو دیکھنے رک جاتی ہوں ۔ان کا چونچال پن مجھے حیران کرتا ہے۔ برسوں پہلے ان ہی گلیوں میں گزارا اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔اگر ہمیں اس وقت یہ پتہ ہوتا کہ بڑے ہو کر ہمارے ساتھ کیا ہونے کو ہے،تو ہم بچپن کی ان خوشیوں کو معمولی نہ جانتے۔کل ان لڑکیوں کے ساتھ کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں کانپنے لگتی ہوں۔

''جو کچھ قانون اجازت دیتا ہے۔اور قانون کیا دیتا ہے؟ سودن کا خرچہ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قانون کو عورتوں کا کتنا خیال ہے۔سودن کا خرچ ہتھیلی پر رکھ کر گھر سے باہر سڑک پر دھکا دے دو۔

عورت کا سامان صحن میں بندھا رکھا ہے۔تھوڑی دیر میں وہ ایک مزدور کو ساتھ لے کر آتی ہے۔قلی سامان اپنی پیٹھ پر لاد کر چلتا ہے۔اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جالگتی ہے۔عورت نے چابی جلدی سے مجھے پکڑائی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی کہ قلی کہیں بہت آگے نہ نکل جائے۔

میں اپنے کمرے کا جائزہ لیتی ہوں۔اتنا خالی چھوٹا اور اتنا ویران۔لیکن اس سب کے باوجود یہ میرا کمرہ ہے۔ میں اس کے لئے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔

میں شیخ کو بتانے جاتی ہوں کہ میرا کمرہ خالی ہوگیا ہے۔''میں آپ کی عنایت کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی''۔

''شکریہ صرف اللہ کا''۔

میں ان کے ہاتھ چوم کر رخصت ہونا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے آواز دیتے ہیں۔

''یہ گدا اور کمبل لیتی جاؤ''۔

شکریہ ادا کرنے کو کوشش کے باوجود مجھے لفظ نہیں ملتے۔ اپنی ساری زندگی میں،
میں نے ایسی بے بسی نہیں دیکھی تھی۔ میں بستر سر پر اٹھا کر عجب خاکساری سے چلتی ہوئی گھر
کی راہ لیتی ہوں۔

اس زمانے میں جب مبلغ بھی زانی اور شرابی شیخ نیکی اور شرافت کا سرچشمہ ہیں۔

میں شہرزاد کی طرح گن گن کر اپنے کمرے میں۔ اپنے ماں باپ کے گھر، سو
میں سے دوسری رات گزارتی ہوں۔

دوسرا باب

پختہ عمر اور پکے بال لیے میں اس ٹھنڈ کے مارے ٹھٹھرے ہوئے شہر میں واپس آئی ہوں۔ سب چیزیں مٹ گئی ہیں۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے زیتون کے پیڑ بھی۔ آزادی ایک عظیم منزل تھی۔ جیسے جنت کی کنجی۔

مجھے اس کمرے کو رکھ لینے کی قدر و قیمت اب معلوم ہو رہی ہے۔ میرے تحت الشعور میں کوئی چیز ایسی تھی جس نے مجھے یہ جگہ بیچنے نہ دی اور ویسے بھی ہمارے شہر کی عورتیں ورثہ میں ملی جائیداد بیچتی نہیں۔ اس جگہ کے لوگ شہر اور دیہات کی ملی جلی وضع کی زندگی گزارتے ہیں۔ جیسے ہم بیک وقت دو نشستوں پر بیٹھے ہوں۔ سنگ مرمر، خطاطی، رغنی در و دیوار، ہماری شہری نفاست کا پتہ دیتے ہیں۔ جبکہ زمین اور فطرت سے محبت ہمارے دہقانی ورثہ کی نشانی ہے۔

اس وادی میں پہاڑوں کے دامن میں شہتوت، انار، چیری اور زیتون کے باغ تھے۔ میدانوں میں خربوزوں کی فالیز، کھیرے اور مکئی بوئی جاتی تھی۔ اٹلس کے اونچے پہاڑوں کا سایہ اس شہر پر تھا اور ان کے کونے کونے سے آبشار، جھنے ندیاں پھوٹی پڑتی تھی۔ جنہوں نے غرناطہ دیکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ ہمارا شہر اس سے بہت ملتا تھا۔ مگر یہاں آمدنی کا وسیلہ ان چھوٹے چھوٹے باغوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان باغوں کی خاطر ہمارے مردوں نے جانیں دیں، بہت سے تو راتوں کو پانی دیتے جان گنوا بیٹھتے۔ ان باغوں کے چوروں نے ہمارے اور ہمارے شہر کے میئر کے لئے زندگی جہنم بنا دی تھی۔ شہر کی جیل ان سے اٹی پڑی تھی مگر چور پھر بھی باز نہ آتے تھے۔

ہاں، ہم اپنی زمین سے بھی اسی طرح چمٹنے والے لوگ تھے جس طرح موروثی جائداد سے اور اپنی اس دوہری جبلت سے ہمیں زراعت اور حرفت کا فن آ گیا تھا۔ اس

شہر کے سوا شاید کہیں اور بھی ایسا قران السعد ین ہو۔ واللہ اعلم۔ مجھے تو صرف فیض کیسا بلا نکا اور رباط کا ہی علم تھا۔ ہاں قصبے جہاں آزادی کی تحریک مجھے لئے گئی۔ مولے بوجیب، خمسیط، سوق العربہ، میں انہیں کس طرح بھول سکتی ہوں؟ میرے ذہن میں یہ نام اس طرح ڈھلے ہوئے ہیں جس طرح دھات میں سکے۔

رواج کا حکم یہ ہے کہ کوئی عورت اپنی جائیداد نہیں بیچ سکتی۔ میں تو ایسی ہی باتوں کے ذکراذکار میں پلی بڑھی۔ جب ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنی دادی۔ نانی کو یہ ہی کہتے سنا کہ عورت کے پاس سوائے اس کے شوہر اور جائداد کے کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ شوہر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

اس شہر کے متعلق میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، وہ میرے بچپن کے نقوش ہیں۔ آج کل کے بچے تو پڑھنے جاتے ہیں۔ زراعت اور حرفت دونوں آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور بہت سے لوگ رباط اور کیسا بلا نکا کو ہجرت کر گئے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں یہاں لوگوں کی گزر بسر کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ ندیاں تک تو سوکھ گئی ہیں۔ اس شہر کو کیا ہو گیا۔ کس کی نظر کھا گئی کیا میری طرح اسے بھی موت کا حکم سنا دیا گیا۔

میرے ابا کا گھر مکینوں کے بوجھ تلے دھنستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے فیض کا وہ ہوٹل یاد آتا ہے جہاں میں نے ایک دفعہ ایک رات گزاری تھی۔ صحن تو بالکل ہی ابتر حالت میں ہے۔ کسی دن یہ ہمارے بوجھ تلے دھنس جائے گا اور لگتا ہے ہم سب اس تہہ خانے میں دفن ہو جائیں گے۔ وہ گھر جو علی بابا کے غار کی طرح میرے ابا کے ذہن میں جادو کی ایک دنیا سا تھا۔ اس تہہ کانے میں انہوں نے اپنے اوزار، ہل کلہاڑے، بیلچے اور جانے کیا کیا وہاں رکھ چھوڑا تھا۔ مویشی بھی وہیں رہتے تھے۔ میرے ابا کا سب سے اچھا وقت وہیں کٹتا تھا۔ جب وہ تیل کے لیمپ کی روشنی میں اپنے ان خزانوں میں مگن رہتے تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ لیکن میں نے انہیں کبھی ایسے نہ دیکھا کہ ان کی تیوری چڑھی ہوئی نہ ہو۔ اگر غلطی سے کبھی مسکرا دیتے تو فوراً ہونٹ بھینچ لیتے اور ہم سب پر برس پڑتے جیسے یہ بھی ہماری خطا ہو۔ ایسے میں سب بہن بھائیوں کی شامت آتی۔ بس میں بچ جاتی۔

یہ اس دن سے ہو گیا تھا جب چلے کے جاڑے میں کہ بڑوں کو بھی دانتوں پسینہ آ جاتا، میں نے چاہے بے دلی ہی سے سہی، زیتون چن چن کر جمع کئے تھے۔ اس لاڈ کی ایک

اور وجہ بڑی دیر میں میری سمجھ میں آئی ۔ میں اپنے ابا کے ساتھ نہیں رہتی تھی ۔ میں تو ان کی آواز سن کر گھبرا جاتی شاید اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے تعلق کی وجہ سے اور اس وقت تک ڈری رہتی جب تک یا تو ابا گھر سے چلے جاتے اور یا میں اپنے نانا کے گھر چلی جاتی ۔

جہاں تک میری اماں کا معاملہ ہے ۔تو میرے احساسات کچھ لاتعلق سے ہیں ۔ ان سے مجھے نہ محبت تھی نہ نفرت بلکہ کچھ بھی نہیں تھا ۔ایسا لگتا ہے جیسے وہ کوئی اجنبی ہوں اور کہیں رستہ چلے ملاقات ہو جائے ۔میرے نانا کی طرح بہت لاغر تھیں اور بڑی سی ناک تھی ۔ جب بھی میں ان کا تصور کرتی ہوں تو اپنی گلی میں ایک سفید براق دھاری دار چادر میں لپٹا وجود آنکھ کے سامنے آ جاتا ہے ۔صفائی کا انہیں خبط کی حد تک خیال تھا اور گھر کے کام میں بغل وغش جٹی رہتی تھیں ۔کام کرتے میں وہ گنگناتی رہتیں ۔ان کے گیتوں میں ان کے دشمنوں کا ذکر ہوتا تھا ۔ان کے کانوں میں سرخ موتیوں کے آویزے ہوتے ۔ یہ موتی درمیان سے سفید ہوتے تھے ۔جب بھی میری نانی اماں ان کے لئے کشیدہ کاری کے سلیپر، آویزے اور کپڑا فیض سے لے کر آتی تھیں اور ہم سب اس سامان کو شوق سے دیکھا کرتے تو نانا یہی کہتے رہتے ۔''اللہ کرے تم اسے ہنسی خوشی پہنو'' جس کا یہ جواب نانی اماں دیتیں ''جلنے والوں کا منہ کالا'' یا ''دشمنوں کی آنکھیں پھوٹیں'' یا اسی طرح کی کوئی اور بات ۔ان سب کا نشانہ میری پھوپھیاں اور چچی تائیاں ہوتی تھیں اب مجھے یہ یاد نہیں کہ اس بات کا احساس مجھے کب ہوا ۔لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ بار بار کی تکرار نے مجھے اس بات کا احساس دلا یا دیا تھا کہ میری بے چاری اماں جیسے سانپوں کے بل میں رہتی ہوں ۔

بہر حال میرا گھر تو میرے نانا کا گھر تھا ۔جہاں ہر روز آنکھ کھلتے ہی میں اپنی زندگی اور اس کی رحمتوں کے لئے اللہ کا شکر ادا کرتی ۔

میرے نانا کی عمر کوئی سو برس کے لگ بھگ ہوگی ۔شاید کچھ کم یا کچھ زیادہ ۔کچھ مجھے قطعی طور پر معلوم نہیں ۔ان کے دانت ایک دفعہ گر کے پھر دوبارہ نکل آئے تھے ۔وہ پہاڑ کے رہنے والے تھے ۔نیچے شہر میں آ کر رس بس گئے اور یہیں میری نانی سے بیاہ کر لیا ۔عربی وہ فصاحت سے بولتے تھے ۔میرے ذہن میں ان کی یہ تصویر ہے کہ سفید قمیض جس کے کندھے پر ایک چاک ہوتا اور اس میں ان کے پیسوں کی تھیلی لٹکتی ہوتی ،سر پر بھاری صافہ، پکے انجیر کی سی ناک اور سفید داڑھی ۔

میں ادھر ادھر کھیلتی کودتی پھرتی اور جو جی چاہتا وہ کرتی اس گھر میں میرا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا تھا۔ میرا دل امنگ سے بھرا تھا اور سامنے امیدوں کا گلابی رنگ زندگی میں بکھرا پڑا تھا۔ میں زندگی کی اسیر تھی۔ میں انگور کی بیل کی جڑ پر نگاہ ڈالتی اور بیل کے ساتھ ساتھ اوپر چھجے تک میری نظر چلی جاتی پھر مجھے لگتا میری خوشی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

جب میں گھر لوٹنے کا سوچتی ہوں اور گھر میرے لئے میرے نانا کا گھر ہے لیکن اب وہ ہے کہاں؟ ان کے وارثوں نے اس کو بیچ ڈالا اور اس کے بعد جانے وہ کتنی بار بک چکا۔ اب میں بے گھر ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ شہر ایک ایئرپورٹ ہو اور میں ٹرانزٹ کا مسافر ہوں جسے کوئی ہاتھ ہلانے والا بھی نہ ہو، لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں۔

''یہ اب تمہاری ہے جب تک کہ یہ تمہیں روئے یا تم اسے روؤ''۔ جب بھی میری نانی پھر پرانا قصہ لے بیٹھتیں تو میرے نانا یہ بات دہراتے۔

''جس سال تمہاری ماں کی شادی ہوئی تم اسی سال پیدا ہوئی تھیں۔ ماں تمہاری ایسی بیمار پڑ گئی کہ ہم سب تو اسی میں لگ گئے اور تمہارا کسی کو خیال تک نہ آیا۔ (میں پہلے دن سے ہی بوجھ تھی) پھر ہم نے اس سے تم کو مانگ لیا اور وہ راضی ہوگئی۔''

اس وقت میرے نانا بیچ میں بات ٹوکتے اور میرے ابا کی یہ بات دہراتے کہ ''یہ اب تمہاری ہے جب تک کہ یہ تمہیں روئے یا تم اسے روؤ'' میرے نانا کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد میری نانی کا بھی انتقال ہوگیا اور مجھے احساس ہوا کہ میں تو کسی کی بھی نہ تھی۔ میری نانی کی تصویر ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسکراتی ہوئی اور جس کے چار طرف ریشم کی جھالر لٹکتی ہوئی۔ مجھے وہ ریشم وہ تار اچھے لگتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ کی طرح وہ بھی ان کے چہرے کا حصہ لگتے تھے۔ اپنی بھاری کمر کے گرد وہ کشیدہ کی ریشمی چوڑی بیلٹ باندھتی تھیں۔ ان کی طبعاً نیکی اور عنایت اس ہر شخص پر ارزاں تھی جو ان کے قریب تھا۔

بلوغت کے صحرا میں داخل ہونے سے پہلے میرا بچپن ان دو لوگوں کی وجہ سے ایسے گزرا جیسے ایک سایہ دار جزیرہ پر زندگی گزرتی ہو۔

سبزہ، گرمیوں میں بھی ہمارے شہر میں عام تھا۔ لیکن بہار میں تو قیامت کا سا عالم رہتا تھا۔ میرے نانا کا باغ ہماری سیر وتفریح کا مرکز بن جاتا۔ جب بھی مجھے اس باغ اور

بہار کا خیال آتا ہے تو ان پھلوں پھولوں کی خوشبو مجھ میں رس بس جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بچپن کی معصوم اور سادہ لوح یادیں بھی امنڈ آتی ہیں۔

باغ تک جانے کے لئے ایک لمبی سی سڑک تھی جس کے دونوں جانب ڈھیروں پھول کھلتے تھے اور چڑیوں کی چہکار گونجتی تھی۔ دونوں طرف باڑ لگی ہوئی تھی جس کے پتے اور کانٹے اس کے پھل کو چھپائے رکھتے تھے۔ باڑ کے اوپر انار کی شاداب شاخیں جھولتیں اور ان کے پھول انگاروں کی طرح دہکتے بچپن سے ہی مجھے انار کے پیڑ ہر چیز سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

اس سڑک پر چلتے چلتے ہم ندی تک جا پہنچتے جس پر لکڑی اور کچی اینٹوں سے میرے نانا نے ایک بھدا سا پل بنایا تھا۔ زمین میں دھنسا باوا آدم کے وقتوں کا سا باغ جیسے اس پر آری چل رہی ہو اور آخر باغ آنکھ کے سامنے آجاتا، پہلے سبز رنگ میں شرابور اور پھر پھولوں کا طوفان۔ پتوں اور پھولوں کی پہچان سے میں نے مختلف پیڑوں کے نام سیکھے۔

شہتوتوں کے نیچے بچھی سفید چادریں بھی مجھے یاد ہیں اور کسی کا ٹہنیوں کو ہلانا بھی۔ پکے شہتوت اولوں کی طرح گرتے اور پھر ہری پتیاں نرمی سے زمین پر گرتیں۔ پاس ہی ہم بچے اور عورتیں، جھولے پر اپنی باری کا انتظار کرتے۔ جب میری باری آتی تو میری نانی میری پینگ بڑھاتیں اور ساتھ ساتھ کوئی گیت گاتیں جس میں میرا نام بار بار آتا اور میں اس طرح کھل کھلا کر ہنستی جیسے زینے پر پانی پھسل پھسل کر بہتا ہے۔ تب ہنسی بات بے بات آتی تھی اب میں ہونٹ پھیلا لیتی ہوں، مسکرا نہیں پاتی۔

ایک سال میں میں نے اون کاتنا، لچھیاں بنانا، بھگونا اور انہیں سلجھانا سیکھ لیا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں میں اپنی نانی کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس سے مجھے جن دو چار پیسوں کی کمائی ہوتی نانی جب بھی فیض جاتیں میرے جہیز کے لئے کوئی نہ کوئی چیز خرید کر ڈال لیتیں یا کوئی زیور خرید لیتیں تاکہ آنے والے دنوں میں میرے کام آئے۔ ہم عورتیں بچپن سے ہی آنے والی آفتوں کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔

اب میں نے خود کو اس کمرے میں تنہا کر لیا ہے۔ کہتے ہیں ذہانت غور و فکر کرتی ہے۔ سب بکواس ہے۔ میں ان لوگوں کو جانتی ہوں، غربت نے جن کی اخلاقیات کو پست کر دیا ہے۔ میں نے خود کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے ''یہ کسی سے ملتی ملاتی نہیں''۔ بولنے تک

میں تو خست برتتی ہے۔ان بے چاروں کو کیا معلوم؟ کچھ عورتیں مجھ سے ملنے آتی ہیں لیکن دوسروں کی اتنی غیبت کرتی ہیں کہ میرا جی متلا جاتا ہے۔میرے اندر ایک کوفت لہریں لیتی ہے اور میرے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگتی ہے۔میں اپنا برقع اوڑھتی ہوں اور باہر نکل جاتی ہوں۔ان کی باتوں کو خاک میں ملانے کے لئے۔وہ یہ ضرور کہتی ہوں گی ''ہلی ہوئی ہے یہ'' یا زیادہ سے زیادہ مجھے پاگل کہہ لیں گی۔نری پاگل۔اب مجھے نہ تو خوشامد آتی ہے، نہ بات ٹالنا اور نہ باموقع شرمانا۔لیکن اس نااہلی نے مجھے عجیب طرح سے مضبوط بھی کر دیا ہے۔کاش میری مشکلیں زندگی میں ذرا جلدی آ جاتیں۔

اس حرامزادے کو تو کبھی وہ سزا نہیں ملے گی جس کا وہ اہل ہے۔کاغذ تو پہنچ جائیں گے یہ حکم لے کر کہ ''جو کچھ قانون کے مطابق دیا جا سکتا ہے'' اور قانون کے مطابق تو کچھ بھی نہیں ملتا۔میری حیثیت ایک نالائق طالب علم کی سی ہے جو برسوں جان توڑ محنت کے بعد ناکام ہو جاتا ہے اور ایک قلم نکال دیا جاتا ہے۔وہ کر کیا سکتا ہے اور میں بھی کیا کر سکتی ہوں؟ کاش میں کچھ کرنے کا سوچ سکتی؟ اور اس شہر جیسی مردنی میں کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟

یہاں انہوں نے پھر جھاڑو دینا شروع کر دی۔اس معاملے میں یہ ذرا نہیں چوکتیں۔جیسے ہی سورج طلوع ہوتا ہے ان پر صفائی کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔اگر کر سکیں تو چھتیں بھی جھاڑ پونچھ کر رکھ دیں اور جس دن کپڑے دھونا ہوں اس دن ایک دھجی بھی سوکھی نہیں رہ سکتی۔یہ سب مجھے میری ماں کی یاد دلاتی ہیں۔

اچانک مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ابھی تو مجھے اپنے مرحوم رشتہ داروں سے بھی ملنا ہے۔جمعہ کا خطبہ سن کر، میں نے روٹی اور خشک انجیر خریدے اور قبرستان کو چل دی۔لوگوں کی بھیڑ ہے کہ اندر آ جا رہی ہے۔کچھ موم بتیاں جلا رہے ہیں اور کچھ لوگ تلاوت کر رہے ہیں۔مجھے ہر کسی کی قبر مل جاتی ہے سوائے اپنے نانا کے۔جب میں روٹی اور انجیر بانٹ چکی تو ایک مجاور مجھے ایک مزار پر لے گیا۔میں وہاں بیٹھی تو ایک طرح کا سکون میرے اندر تیر گیا۔اس سکون میں موت دل آویز لگتی ہے لوگ پھر بھی اس سے اتنا خوف کھاتے ہیں۔مجھے اس طرح کے بنے ہوئے مزار اچھے نہیں لگتے۔مردوں کا شہر۔دور سے مجھے شہر کی دیوار کے پرے سفیدی کی ہوئے مستطیل چھتیں ان ہی مقبروں کی طرح لگتی ہیں ایک اور طرح کا شہر، نہیں معلوم میرے ذہن میں موجود کیا چیز یہ موازنہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

جیسے ہی سورج ڈھلتا ہے میں چلنے کو اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ایک عجیب غیر متوقع سی سنجیدگی مجھے مطمئن کر دیتی ہے اور میں اس احساس کو اپنے اندر بچائے رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس وقتی توانائی کو غنیمت جانتی ہوں اور شہر میں گھومنے پھرنے کا فیصلہ کر لیتی ہوں۔ میں ہر گلی کوچے سے گزرتی ہوں۔لکڑی والوں کی ٹالوں سے آگے، غلے اور کپڑے کی منڈیاں، لوہار اور میرے نانا کا گھر سب کچھ گزر جاتا ہے۔ میں رک جاتی ہوں اور دیر تلک کھڑی رہتی ہوں۔لوگوں---مردوں، بچوں عورتوں کو اندر آتے جاتے دیکھتی رہتی ہوں۔اتنے لوگ تو ہیں جتنے کہ تین خاندانوں کے مرد ہوں۔سب کے سب پہاڑوں سے آئے ہوئے تارکین وطن۔ چوک کے فوارہ کا پانی پرانے کھرنجے پر مسلسل گر رہا ہے۔ایک وقت ایسا تھا جب اس فوارے کے بہتے پانی سے اپنا گھر صاف کرتے، کپڑے دھوتے، اون بھگوتے، انگوروں کی بیلوں کو پانی دیتے اور اپنی گایوں کو پلاتے اور اب یہ عالم ہے جیسے ہم یہاں کبھی تھے ہی نہیں۔

رات ہونے تک میں اپنے آپ کو بھولی رہتی ہوں۔ میں ان تاریک گلیوں میں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چاہتی۔ میں بے مقصد گھومتی رہتی ہوں۔سڑک کی جو چند روشنیاں ہیں، وہ غیر ملکی قبضہ کے دنوں کی یادگار ہیں اور بس روشنی بھی یونہی مدھم سی ہے۔ایک کھمبا ہر گلی کے لئے، بلب پر دھات کی ایک تھالی یا ٹوپی سی ہے جو سرخ مٹی کی دیواروں پر گڑی ہوئی ہے اور ارد گرد گھاس اگی ہوئی ہے۔ پل ویسے ہی ہیں جیسے کہ ہمیشہ سے تھے۔وہ شاید ادریس اتل کے وقت میں بنے تھے۔پرانے خستہ حال پل، پیدل چلنے والوں اور جانوروں کے گزرنے کے لئے۔اندھیرے میں دریا ملگجا اور ڈراؤنا لگتا ہے۔رات کی خاموشی میں پانی کی آواز ایسے لگتی ہے جیسے کوئی غرارے کرتا ہوا۔ یہ وہ شہر ہے جو مرغ کی اذان سے جاگتا ہے اور مغرب کی نماز ہوتے ہی گلیوں میں بلیاں غرغراتی پھرتی ہیں۔

میں چلتی جاؤں، بس چلتی جاؤں تاکہ یہ سکون ذرا دیر ٹھہرا رہے۔ میں جانتی ہوں میری بے چینی پھر میرے اندر در آئے گی۔میری بارات بھی اسی گلی سے گزری تھی اور وہ میرے اس گھر تک جا کر رک گئی تھی۔ایک ایسا انجوگ، جس پر سب مجھ سے رشک کرتے تھے۔انہیں تو میرے دولہا پر بھی رشک آتا تھا۔ان دنوں میں فرانسیسی کا استاد ہونا کچھ معنی رکھتا تھا۔ میں نے منگنی سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔اس نے مجھے نانا کے گھر کے

دروازے پر کھڑے دیکھا تھا جب میں گویوں کے ایک جلوس کو گزرتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو رشتہ مانگنے بھیجا تھا اور اس انتخاب کی وجہ تھی میرے لمبے بال اور میری سیاہ آنکھیں، مجھ سے پہلے اس کے گھر والوں نے بہت سی لڑکیاں اس کے لئے دیکھی تھیں لیکن اس کو ان سب میں کوئی نہ کوئی عیب نظر آ جاتا تھا۔ بہت لمبی ہے، قد بہت چھوٹا ہے۔ جسم اچھا گدرایا نہیں۔ رشتہ دار بہت ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے ابا نے انہیں یہ بتلا دیا یہ بچی تو اپنے نانا کی ہے اور گھر والوں نے مجھے اس سے بیاہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میری پسند یا ناپسند کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اس کے بعد ہر تیوہار پر دولہا کے یہاں سے تحائف آیا کرتے۔ ایک دن مجھے یہ پتہ چلا کہ شادی اگلے ہفتہ ہونے کو ہے۔ مجھے تو جیسے خوف نے دبوچ لیا۔

آخر کار رسمیں تقریبات شروع ہوگئیں میرا جہیز بننے لگا۔ مٹھائیوں کی تیار ہونے لگی۔ دولہا کے یہاں سے چیزیں آنے لگیں۔ حتیٰ کہ شب عروسی آ گئی۔ شادی کی رسمیں سات دن تک ہوتی رہیں۔ ان دنوں میں میں اپنی نانی کا سامنا کرنے سے کتراتی اور کہیں کونے کھدرے میں چھپ چھپ کر روتی۔ جس رات میں اپنے سسرال رخصت ہو رہی تھی رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ برسوں پہلے کے احساس کی ایک کیفیت کہیں سے پھر پلٹ آئی۔ میں اپنی نانی کے ساتھ مولائی ادریس دوئم کے مقبرے پر گئی تھی، جو کی روٹی اور سیاہ زیتون کھا رہی تھی۔ جب میں نے سفید چادر میں لپٹا ایک جنازہ دیکھا تھا اس کے اوپر ایک سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ ڈر کے مارے میرا جی متلانے لگا تھا۔ میں نوالہ چباتی تو رہی لیکن وہ مجھ سے نگلا نہیں جا رہا تھا۔ اسی خوف اور نفرت کے احساس میں لپٹی میں اپنے نانا کے گھر سے رخصت ہوئی۔ بارات کو میری سسرال تک پہنچنے میں وقت لگا اور سارا وقت میرے منہ میں زیتون اور جو کی روٹی کا ذائقہ گھلا رہا۔ تو کیا دل کو پتہ چل جاتا ہے جب مسافر غلط راستے پر چل نکلتا ہے؟

شادی کی دھوم دھام ختم ہوئی تو میری ماں اور نانی دونوں بستر میں آرام کرتی رہیں۔ ہماری بیسیوں تقریبات کی اس گہما گہمی کی وجہ وہ محرومی ہے جو تفریح کی کمی سے پیدا ہوتی ہے۔

میں نے اپنی سسرال میں ایک سال گزارا۔ اس طرح کہ ایک دفعہ بھی گھر سے

باہر قدم نہ نکالا۔حتیٰ کہ جب کسی طرح یہ آثار ہی ظاہر نہیں ہوئے کہ ماں بننے والی ہوں ،تو مجھے مزاروں کے چکر لگوانا شروع کیے گئے۔ میں نے اگر بتیاں جلائیں تعویز پہنے اور ہر طرح کے کاڑھے پی ڈالے۔ وہ مجھے دیتے میں زہر بھی پی لیتی۔ جب ان کی آس ٹوٹ گئی۔تو مجھ سے سلوک بھی ویسا نہیں رہا۔ان کے طعنے تشنے سن سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ قصور میرا ہی ہے اور مجھ پر اپنے گناہ کا بوجھ بڑھتا گیا اب مجھے اس طرح کا یقین نہیں ہے کہ خطا میری ہی تھی۔

اگر وہ اپنی ماں کی بات مان لیتا تو اس وقت ہی مجھے طلاق دے چکا ہوتا۔جس معاشرے کو ایسی صورت حال میں اصل واقعہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہ ہو وہاں بانجھ پن ہی کافی ہے۔ یا کم از کم وہ دوسری شادی تو کر ہی سکتا ہے۔اس کی ماں ،اس کی یہ فتح دیکھنے کو تو زندہ نہ رہیں لیکن ایک زمیندار کی طرح میری زندگی کی حکمرانی ان کے حصہ میں آئی۔ ہر صبح اٹھ کر میرا پہلا فرض یہ تھا کہ بیٹے کو جنم دینے پر ان کی تعریف کرتی رہوں۔ پروردگار پھر کبھی ایسا زمانہ جینے کو نہ ملے۔

اب مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں نے وہ دن کیسے گزار لئے۔اگر اس وقت میرے دل میں ایسے ہی خیال ہوتے جیسے آج ہیں تو میں ان کے منہ پر تھوک کر اس گھر سے نکل گئی ہوتی۔

جس دن میرے میاں نے یہ خبر سنائی کہ اس کا تبادلہ کیسا بلانکا ہو گیا ہے میری ساس نے اپنا منہ سر پیٹ لیا۔کپڑے پھاڑ ڈالے اور بیٹے کو ماں کو چھوڑے جانے اور اسے قابل اعتنا نہ سمجھنے کے طعنے دیتی رہی۔ مجھے اپنی ماں کی بات مسلسل یاد آتی رہی کہ صبر کرنے سے دکھ کم ہوتے ہیں۔ جب میں اس شہر سے چلی تو آزادی کے نشہ سے مخمور تھی۔

گھر والے اور پڑوسی ہمیں شہر کی فصیل تک وداع کرنے آئے۔ جیسے ہی ہماری بس روانہ ہوئی کچھ آنسو پونچھتے اور کچھ ہاتھ ہلاتے بھی نظر آئے۔

سفر میں تین دن لگ گئے۔کوئٹے سے چلنے والی بس ہچکولے کھاتے آگے بڑھتی۔ ان دنوں ہمارا خیال تھا یہ رفتار بڑی تیز ہے ہم نے فیض اور پھر رباط میں بسیں بدلیں۔ ہوٹل میں رات بسر کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ ایک دومنزلہ عمارت تھی۔جس میں کمرے دوسری منزل پر تھے اور ان کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔سامنے ایک کھلا میدان

تھا جو خچروں اور گھوڑوں کے باڑہ کا کام دیتا تھا۔ یہ ہوٹل کا طویلہ یا گیراج تھا۔اس نے مجھے وہ ٹرک یاد دلایا تھا جو ایک دفعہ غلہ اور زیتون ڈھونے کے لئے میرے ابا لائے تھے۔ سارا شہر اسے دیکھنے امنڈ آیا تھا۔ میرے ابا فخر سے مسکرا رہے تھے اور میرے نانا نے کہا تھا یہ مشین نیلے شیطان نے ایجاد کی ہے۔ کاش یہ بھی گھاس چارہ کھاتی ہوتی'' میرے ابا نے جواب دیا تھا۔

کیسا بلانکا سیاہ وسفید ناموں کا شہر ہے۔ مراکش کا دھڑکتا دل ۔جس کے دروازے ہر آنے والے پر کھلے ہیں دور دور سے آنے والے تارکین کی منزل اور پورے ملک کے لئے ان کا اپنا شہر۔ بلند عمارتیں روشنیاں اور کاریں ایک نئی دنیا، ایک انوکھی دنیا۔ ہارے ہوئے فوجی دستوں نے جسے ایک انڈے کی طرح سینت کر رکھا تھا اور اس میں سے ایک ایسی بلانکلی جو اپنے رکھوالوں کو بھی نگل گئی۔ مجھے شہر کو دریافت کرنے میں بہت دیر لگی۔ شروع میں تو مجھے اس سے ڈر لگا، مگر پھر مجھے یہ سارا شہر بہت اچھا لگنے لگا۔ بندرگاہ، سیدی بلیوت کا مزار، مرکزی کیریار کا مضافاتی شہر۔ بن مسک کے مضافات، شاہراہیں، دوکانیں ۔ لوگوں سے ملنے جلنے کی آسانی اور نئے دوست بنانے کے موقعے۔ زرخیز زمین جہاں بیج نمو پاتا ہے۔ میں نے یہاں دس سال گزارے۔ (میری زندگی اسی تقسیم میں گزرتی رہی ہے) دس سال جنہوں نے مجھے ایک مختلف عورت میں ڈھال دیا۔ میرے پیر زمین پر لگے تھے مگر میرا سر اونچا تھا۔ لیکن ابھی بھی مجھے انکار کرنا نہ آیا۔ حتیٰ کہ بدقسمتی میرا مقدر ہوئی۔

کیسا بلانکا کے ان شروع کے دنوں کے لئے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن کچھ یاد نہیں آتا۔ چین کے دن کیسی تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں اور ہم ان پر توجہ بھی کیسے دیتے ہیں۔ ہر دن، پہلے دن کی طرح لگتا۔ میرا وقت گھر کی دیکھ بھال اور اپنے آپ کے خیال میں گزر جاتا۔ نت نئے زیور بدلنا اور نئے نئے کپڑے خریدنا، میری سب سے بڑی خوشی تھیں کیسا بلانکا کے بازار میرا دل موہ لیتے تھے۔ ان دنوں میں دلکشی اور وقار کا نمونہ تھی۔ ''فیشن کی انتہا'' میری اماں کی ہمجولی نے مجھے دیکھ کر یہ کہا تھا۔ جب بھی میں اپنے شہر واپس جاتی انگوٹھیوں اور آویزوں میں لدی پھندی ہوتی۔ میرے آنے کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل جاتی، بظاہر تو ہر ایک مجھ سے

ملنے کو آتا لیکن دراصل میرے زیور دیکھنا مقصود ہوتا۔

پھر آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ یہ ایک اور قصہ ہے۔ میں نے خوشی خوشی زیتون کے باغ، جواہر سب بیچ ڈالے۔ جو کچھ بھی اس قابل تھا کہ بیچا جا سکے اس تحریک کے سامنے ہیچ تھا۔ آزادی کی تمنا نے میری زندگی میں زمرد اور یاقوت کی جگہ لے لی اور آج مجھے اس سب خرافات سے گھن آتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری خواہشیں بدل جاتی ہیں۔

اور جہاں تک آزادی کی جدوجہد کا سوال شروع میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری حیثیت کیا ہے! یا مجھے معلوم؟ میری یادیں دھندلی ہیں۔ کوئی بھی ایک واقعہ یا کوئی بھی تصور ایسا نہیں جس سے نقوش واضح ہوسکیں۔ اپنے میں مگن، اپنی دلکشی اور وقار کے خیال میں جنون کی حد تک مبتلا، بلاشبہ میں ایسی ہی تھی لیکن اس جدوجہد میں باقاعدہ حصہ لینے سے برسوں پہلے، میں نے اپنی رائے متعین کر لی تھی۔ وہ دن اور موقع اچھی طرح یاد ہے۔ وہ قتل عام، وہ کیسا بلا نکا کا سیاہ دن کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ جب بھی مجھے اس کا خیال آتا ہے میں سن سی رہ جاتی ہوں، سب کچھ نظر کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ ہمارے قریب کی بیرکوں سے نکلتے غیر ملکی دستے، ان کی مشین گنیں راہ گیروں کو بھونتی ہوئی۔

ایک مدت تک ان گولیوں کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ زخمی عورتیں اور بچے میرے تصور میں تڑپتے رہے یا فٹ پاتھ پر لاشوں کے انبار، جیسے کاٹھ کباڑ کا ڈھیر۔ لیکن ان سب نے بھی مجھے اسی طرح متاثر کیا، جیسا کہ وہ بھیانک اور خوفناک دن۔ میں کسی کے اپارٹمنٹ میں تھی۔ مالک، جگہ، موقع کسی چیز کے متعلق مجھے نہ جب علم تھا نہ آج ہے۔ خوف کے تسلط میں میں ہوش حواس بھول گئی تھی اور میرا عالم ایسے تھا جیسے کوئی نیند میں چلتا ہو۔

جیسے جیسے اس لمحہ کا اچانک پن کم ہوا، ایک عجیب احساس محرومی نے اس کی جگہ لے لی۔ جیسے کوئی غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ جیسے کوئی پیارا نہ رہے۔ جیسے مزاحمت نااہلی سے بے تاثیر ہو جائے۔ اس دن سے زندگی کا سارا چاؤ میرے لئے ختم ہو گیا۔ لباس و جواہر کی چمک دمک کے ہوتے ہوئے بھی۔ حالات کو بدلنا تھا یا جینا بے کار تھا۔

بات یوں شروع ہوئی کہ بیرک کے سپاہیوں میں سے ایک نے ایک مراکشی

عورت کو چھیڑنا شروع کیا۔ایک مرد،اپنے ہم وطن کی مدد کی پاداش میں گولیوں کا نشانہ بنا۔راہ چلتے اکٹھے ہونا شروع ہوئے ۔لوگوں کا ہجوم مظاہرہ بن گیا اور یہ معصوم مظاہرہ خون میں نہلا دیا گیا۔سینکڑوں نہتے شہری اپنے ہی وطن کی گلیوں میں ذبح کر دیئے گئے ۔ایک کرایہ کے سپاہی کی ہوس نا کی کی قیمت یوں چکائی گئی۔

یادیں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے چلی آتی ہیں لیکن میں اتنی رات گئے اس سنسان گلی میں کیا کر رہی ہوں ۔ مجھے اپنے اردگرد کا ہوش آتا ہے۔وہ تکلیف دہ احساس مجھے پھر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔سامنے کی مسجد سے سائے سے نکلتے ہیں۔ہوا مرطوب ہے اور کچھ لوگ کھانس رہے ہیں۔صبح کی مہک میرے اردگرد پھیلنے لگتی ہے۔صبح کاذب کی نیلگوں روشنی پھیل رہی ہے اور شہر کو روشنی اور مہک نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

تیسرا باب

''تمہارے کاغذات تم تک پہنچ جائیں گے اور وہ بھی جو قانوناً واجب الادا ہے''۔ کس قدر بے شرم ہوتے ہیں لوگ۔ طاقت اور اختیار ان لوگوں کو مل جاتا ہے، جو اسے نبھانے کی پختگی نہیں رکھتے۔ ان کے پاس بڑھنے کا وقت اور گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ رتبے ان کا پیدائشی حق ہیں اور ہمیشہ ان کے اختیار میں رہیں گے۔ ایک دن وہ بھی ان تلخ حقیقتوں کا سامنا کرے گا جیسی کہ میرے سامنے ہیں اور اس کی دنیا بھی ایک دن کرچی کرچی ہوکر رہ جائے گی۔ کیا میں نے یہ تمام عرصہ ایک دشمن کے ساتھ گزارا۔ اگر اس عہدہ پر اس کی تقرری نہ ہوئی ہوتی تو میں واقعی اسے جانے بغیر ہی مر جاتی۔

کاغذ پہنچ جاتے ہیں اور وہ بھی جو قانوناً واجب ہے۔ ڈاک خانے نے مجھے مطلع کیا ہے۔ میں دو قطاروں میں اپنی باری کا انتظار کرتی ہوں ایک کاغذات کے لئے اور دوسرا منی آرڈر کے لئے۔

دنیا میں کیا اس سے بھی بڑی کوئی بات بے عزتی کی ہے؟ میرے لئے تو نہیں۔ جب میں منی آرڈر کا فارم مانگتی ہوں اور اسے بھرتی ہوں تو میرے اندر تلخی گھلی ہوئی ہے اور مارے غصہ کے میرے سر میں درد کے دھماکے سے لگتے ہیں۔ میں نے تعلیم بالغاں کی ان کلاسوں میں لکھنا سیکھا تھا جہاں جہالت کے خلاف جنگ کے طور پر ناخواندوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ لیکن پڑھے لکھے وہاں کچھ نہیں سیکھ پائے۔

میں وہاں رقم لکھتی ہوں جو میں نے وصول کی ہے۔ اپنے اس شوہر کا نام اور پتہ لکھتی ہوں جو اب میرا نہیں ہے اور رقم اور فارم دونوں ڈاک خانے کے کلرک کو دے دیتی ہوں۔ ایک سرد سی دھند مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ جیسے وہ سب کچھ ابھی ابھی ہوا

ہو۔ جس طرح ایک مہینہ پہلے میں اس گھر سے نکلی تھی، اسی طرح ڈاک خانے سے نکلتی ہوں اور میرا ذہن اسی طرح کھویا ہوا ہے۔ دور یہاں ایک بینچ پر میں بیٹھ جاتی ہوں۔ جب ذرا ہوش آتا ہے تو دیکھتی ہوں کہ میں کہاں ہوں۔ شہر کا ایک باغ، جسے فرانسیسی چھوڑ گئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ایک ٹولی میرے ارد گرد شور مچاتی دوڑتی پھر رہی ہے۔ دنیا کا حال آئے دن تباہ ہور ہا ہے اور لوگ پھر بھی بچے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔

بچے اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔ مجھے یاد نہیں یہ کس نے کہا تھا لیکن اگر یہ سچ ہے تو اللہ کے اس بے حد صبر پر لاکھوں سلام۔

بچوں کے شور سے بدمزہ ہو کر میں گھر کو پلٹتی ہوں۔ آج کے دن کے ملال نے گھر کو بھی اداس کر دیا ہے اور موسم سے بے تعلق ایک یخ بستگی اس سے رس رہی ہے۔ میں اپنا برقع کھینچ کر اتارتی ہوں اس کا گولہ سا بناتی ہوں اور بیٹھ جاتی ہوں۔ کمرے میں ایک پرانے پن کی سی فضا ہے۔ جیسے پرانی کتابوں کی سی۔ کمرہ تنگ لگا ہے اور یہاں جی ہولتا ہے۔ باہر واپس چلے جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن بچوں کے ہنگامے کا خیال آتے ہی میں برقع آہستگی سے اپنے پاس رکھ لیتی ہوں۔ ریڈیو پر پھر وہی سلاوی گا رہا ہے۔ یہ ریڈیو کس نے ایجاد کیا تھا؟ دوسرے کمرے سے لڑنے کی آواز آرہی ہے۔ اس گھر میں کبھی چین نہیں ملتا۔ کیا میرے نصیب میں چین لکھا گیا تھا؟

میں ایک بار پھر برقع سر پر ڈالتی ہوں، گھر سے نکلتی جاتی ہوں شہر میں بے مقصد گھومنے کے لئے۔ نخاس میں پرانی چیزیں خریدنے والوں کا ہجوم ہے اور بولی اپنے عروج پر ہے۔ تو کیا آج جمعرات ہے؟ کپڑے کے بازار میں اونی چادروں میں لپٹی دو عورتوں سے دوکاندار بے ہودہ بات چیت کر رہا ہے۔ یہ بازار دل بجھا دیتے ہیں اور یہ میں کہہ رہی ہوں۔ اپنی عمر کے کتنے سال ان جیسی دوکانوں میں گزارنے کے بعد۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے جیسے ان کی آہنی انگلیاں گلا دبوچ لیں گی۔

''تم تو خود طرحداری کی مثال تھیں'' ہماری پرانی گلی میں رہنے والی بی بی نے کہا تھا۔ یہ میری ماں کی ایک سہیلی تھیں جنہوں نے مجھے نت نئے کپڑوں گہنوں میں لدا پھندا دیکھا تھا۔ جب میں فتح منڈی میں سرشار میکے پلٹتی تھی۔ جیسے ہی میرے آنے کا پتہ چلتا شہر

والے ہمارے گھر میں اڈے چلے آتے ۔ یوں تو مجھ سے ملنے کی وضعداری نبھانے لیکن دراصل میرے زیورات کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ۔ ناامیدی لاپرواہ کر دیتی ہے ۔ اس عورت کو دیکھتے ہوئے ، یہ خیال میرے ذہن میں ہے لیکن جو کچھ میری آنکھ کے سامنے ہے وہ مجھے بے چین نہیں کرتا ۔

میں شہر سے باہر نکل جاتی ہوں ۔ چوک سے گزر کر بس اسٹیشن سے بھی آگے چلی جاتی ہوں ۔ کچھ بے گھرے مرد قبرستان کے سناٹے میں بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہے ہیں ۔ ان میں سے ایک قبر کے کتبہ پر شراب کی بوتل توڑ دیتا ہے ۔ شیشے کے چھناکے کے ساتھ میں گھوم کر شہر کی طرف تیزی سے پلٹی ہوں ۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے اور میں سیدھا مزار کا رخ کرتی ہوں ۔

کچھ عورتیں شیخ کے پاس بیٹھی تھیں ، مگر وہ جلدی چلی جاتی ہیں ۔ میں ان سے بات کرنے کو آگے گھستی ہوں اور انگلیوں سے اپنے جلابہ کی آستین مروڑ رہی ہوں ۔

''حضور حالات تو اور بھی ابتر ہوتے جا رہے ہیں'' ۔

''تسلی رکھو ، مجھے بتاؤ کیا ہوا ؟'' وہ مجھے غیر معمولی متانت سے جواب دیتے ہیں ۔ میں آنسو پینے کی کوشش میں کچھ دیر چپ رہتی ہوں ۔ ایک گولا سا نگل کر میں کہتی ہوں'' کاغذات پہنچ گئے'' ۔

''کیا تمہیں آنے کی خبر نہ تھی ؟''

مجھے معلوم تھا ۔ ۔ ۔ مگر'' ہم دونوں چپ رہتے ہیں ۔ ایک نابینا قاری کی آواز مزار میں گونج رہی ہے ۔ جیسے جیسے میں لفظ سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں میرا ڈر کم ہوتا ہے اور میں پرسکون ہو جاتی ہوں ۔

''آخر میرا ہوگا کیا ؟'' میں بے تکے پن سے پوچھتی ہوں ۔

وہ جنبش کئے بغیر سرکنڈے کے قلم سے لکھتے رہتے ہیں اور رسان سے جواب دیتے ہیں ۔

''وہ جو ایمان رکھتا ہے اسے نہ خوف نہ حزن و ملال ۔''

''صحیح ، لیکن میں فاقوں سے مر سکتی ہوں ۔''

''اسلام کی سرزمین میں کوئی بھوک سے نہیں مرتا ۔''

''مگر میرا تو کوئی سہارا نہیں۔''

''شہر میں قالینوں کا ایک کارخانہ ہے۔''

''لیکن مجھے قالین بننا نہیں آتا۔''

''سوئٹر تو بننا تو آتا ہوگا۔''

''میری نظر اتنی کمزور ہے۔''

''پھر بھی تم بن تو سکتی ہو۔''

''تمہاری روح کو سستی اور کاہلی سے زنگ لگ جائے گا۔''

اس گھڑی مجھے خیال آتا ہے میں اون کات سکتی ہوں۔ میں شیخ کو یہ بات اس طرح خوش ہوکر بتاتی ہوں جیسے سونا ہاتھ آ جائے۔''دیکھا'' وہ کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں اون کات سکتی ہوں، جیسے مجھے شیخ کا نام یاد نہیں۔ جیسے مجھے یہ یاد نہیں کہ آج کون سا دن ہے۔جیسے میں گلیوں میں راستہ بھول جاتی ہوں۔ مجھے ہوش کے ناخن لینا چاہئیں۔

تیئس سال سے میں نے چرخے کو چھوا تک نہیں۔ضرورت ہی نہیں پڑی۔اور پچھلے چند سالوں میں عورتیں آزادی کی جدوجہد میں اس طرح مصروف رہیں کہ انہوں نے چرخے پھینک پھانک دیئے۔

آزادی کی اس جدوجہد میں اس نے کب حصہ لیا تھا؟ مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں۔ جس دن مجھے پتہ چلا ہکا بکا رہ گئی تھی۔ یہ ویسی ہی حیرت تھی جو اس لمحہ مجھ پر گزری تھی جب اس نے میرے سامنے بیٹھ کر کہا تھا''تمہارے کاغذات بھیج دیئے جائیں گے اور وہ کچھ بھی جو قانون کے مطابق واجب ہے۔مگر پہلی حیرت سے خوشی ہوئی تھی بلکہ ایک ترنگ۔ اس میں کرب کہیں نہیں تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں بھی اس جدوجہد میں پوری طرح شریک تھی اور اپنی مادر وطن کے لئے بہت سے کام کئے تھے۔لیکن اب میری مادر وطن میرے لئے کیا کر رہی ہے؟

''اس جدوجہد کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا''۔ میں شیخ سے کہتی ہوں وہ لکھتے لکھتے رک جاتے ہیں اور اپنے قلم سے میرے چہرہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں''ایسے کام جن کو

کر کے پچھتاوا ہو، اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور نہ وہ لوگ جو احسان جتاتے ہیں۔''

''مجھے اگر وہ سب کچھ دوبارہ بھی کرنا پڑے تو میں کروں گی''۔

میری وطن پرست کارروائیوں کا آغاز، شام کے وقت اس دستک سے ہوا جو کرفیو سے ذرا پہلے ہمارے گھر کے دروازے پر دی گئی۔ نہیں معلوم کون تھا لیکن جو بھی تھا اس کی ضرورت ایسی ہی ہوگی کہ وہ اس وقت آئے۔ دستک تھی نہیں۔ اور اس نے دروازہ کھولا تو میں اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ روشنی میں ایک کمزور چہرہ نظر آیا ہڈیاں نکلی ہوئی، داڑھی بڑی ہوئی، بینگنی رنگت۔ سر پر بڑا سا پگڑ۔ جس میں سے چہرہ ایک بند مٹھی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ میرا شوہر دروازے پر عجب بے یقینی کے عالم میں کھڑا تھا۔ پگڑ والے آدمی نے اسے ایک طرف دھکیلا اور اندر کمرے میں داخل ہو گیا۔

''عورت ابھی تک واپس نہیں آئی ہے''۔

میں نے آگے بڑھ کر ڈرائینگ روم کی کھڑکیاں بند کر دیں۔ دونوں مرد میرے پیچھے پیچھے آئے۔ مہمان پہلے نے اس نے اپنا پگڑ اتارا اور بیٹھ گیا۔ ''میں اپنے آپ کو حوالے کر رہا ہوں۔'' میرا شوہر دروازے سے ٹکا کھڑا تھا اور میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ جیسے کرفیو کا سائرن بجا میں بجلی گل کر دی اور موم بتی جلا دی۔ ہمارے اردگرد کھڑکیاں دروازے بند ہونے کی آوازیں اس طرح تھیں جیسے گولیوں کی تڑ تڑ، پھر ساری گلی خاموشی میں ڈوب گئی جیسے کسی نے اس کی آواز چھین لی ہو۔

''وہ میری بیوی کے پاس آئے تھے''۔ آدمی بولا۔ ''الال نے قبول دیا اور ان لوگوں کو میرا نشان پتہ بتا دیا''۔ اس نے اپنے گھٹنے کی طرف اشارہ کیا میری نظر اس کی انگلی کے ساتھ ساتھ گئی اس کے جلابہ کے نیچے لکڑی کی ٹانگ کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ اس طرح اچانک آیا تھا کہ مجھے اس کی معذوری کا احساس تک نہ ہوا۔ غصہ اس کے رنج پر غالب آ رہا تھا، اسے ڈین بین پھو کے دنوں کا خیال آیا۔ خیال ہی میں جیسے اس نے ان یادوں پر تھوکا اور بولا ''اپنی ٹانگ میں نے فرانس پر قربان کر دی اور اب یہ ان کے مجھ تک پہنچنے کا نشان بنی۔ ان سب مصیبتوں آفتوں کا حال کون لکھے گا کیونکہ یہ تو مجھ جیسوں پر گزر رہا ہے۔ میں نے انڈوچائنا کے لیے یہ قیمت ادا کی ہے۔''

میں نے نظریں اس پر گاڑے رکھیں ۔اپنے آپ سے یوں شرمندہ جیسے فرانس کی زیادتی کے لئے میں جوابدہ ہوں ۔

اس وقت تو اس نے کچھ اور نہیں کہا لیکن آزادی کے بعد وہ اکثر جنگ کے متعلق باتیں کرتا اور بے تکان اپنے قصے دہراتا رہتا۔ ویت نام اس کے لئے ابھی تک انڈو چائنا تھا۔ وہ جب بھی ان دنوں کو یاد کرتا۔ اس کے چہرے کے نقوش دکھ سے ملائم نظر آتے اور اس کی آواز رنج میں ڈوبی ہوتی ۔ وہاں اس کی دو بچیاں تھیں ۔جنہیں جنگ کے بعد سے اس نے نہیں دیکھا تھا۔ بیٹیاں اس طرح کھو گئیں اور قسمت کا کمال یہ کہ اس کی بیوی رقیہ ماں نہیں بن سکتی تھی ۔عجب کھیل ہے قدرت کا۔ وہ ہو جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے ۔

لڑکیوں سے اس کی خط و کتابت تھی ،فرانسیسی میں ،لیکن جب وہ انڈو چائنا کی باتیں ڈوب کر کرتا تو صرف گھنے جنگلوں ،بل کھاتے پیڑوں ،دھوئیں سے بوجھل آسمان ، بندوقوں ،سانپوں اور دھماکوں کی بات ہوتی ۔ یا کیمپ ،نرسوں اور ڈاکٹروں کا ذکر ہوتا ۔ یا وہ ٹانگ جس پر وہ مراکشی افسر کے ماتحت گشتی دستہ میں چل رہا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ ٹانگ غائب تھی ۔اس نے کبھی اپنی بیٹیوں کی بات نہیں کی ۔کبھی بھی نہیں ۔لیکن ہم جانتے تھے ۔ وہ جانتا تھا کہ ہم جانتے ہیں ۔لیکن سب کچھ اسی طرح چلتا رہا اور ہم سب بڑی مشاقی سے انجان بنے رہے ۔

اس کی بیٹیاں اور اس کی ٹانگ انڈو چائنا سے ملے وہ دو زخم تھے جنہیں وہ اپنے دل میں پال رہا تھا۔ اس کی بیٹیاں جو ویت نامی بن کر ہی ختم ہو جائیں گی اور اپنے باپ دادا کا وطن مراکش کبھی نہیں دیکھیں گی اور دھات کا وہ بے ہودہ ٹکڑا ،جس پر وہ دن بھر چلتا اور رات وہ بے جان اور سرد ہو کر اس کے تن سے جدا ،اس کے پاس پڑا رہتا۔ یہ ایسے دو چرکے تھے جو فرانس کے خلاف اس کی نفرت کو کافی تھے اور اسی لئے اس کی مسلسل جنگ جاری تھی ۔

کیا انہی کے مارے وہ جدوجہد آزادی میں شامل ہوا تھا؟ یا ہماری طرح وطن پرستی نے اسے اکسایا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہیں ۔صاف بات یہ ہے کہ اس شام جو کچھ ہوا جب وہ ادنی جلابیہ پہنے ہمارے گھر آیا تھا، اور بعد میں اس نے بار بار اس بات پر اصرار کی کہ ٹانگ کے دکھ کی بات تو الگ رہی وہ اس جدوجہد میں بہر حال شریک تھا۔ مجھے پوری طرح

اعتبار نہیں آیا۔اس کربناک رات کی بات حالانکہ پھر کبھی کسی نے نہیں کی۔لیکن جب بھی میں فقیہہ سے جدوجہد کے دنوں کی بات دہراتی مجھے اس واقعہ کا خیال آئے بغیر نہ رہتا اور مجھے لگتا جیسے وہ جانتا ہو کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔

اس رات جب اس نے یہ کہا تھا کہ ٹانگ کی قیمت انڈوچائنا کے لئے اس نے ادا کی ہے اور جب میں نے گھبرا کر نظریں ہٹالی تھیں تو میرے شوہر نے تحکم سے کہا تھا ''اچھا اس وقت ٹانگ کی بات چھوڑو۔''

''میں بہت خطرے میں ہوں''فقیہہ نے جواب دیا۔(مجھے اس کا نام دنوں بعد معلوم ہوا)

''اب تم اپنا ٹھکانہ چھوڑ دو گے؟''

''مجھے لگتا ہے مجھے وہاں کسی نے دیکھ لیا ہے۔ایک پڑوسی عورت نے اور اس نے افواہیں پھیلانا شروع کر دیں۔تب اس عورت نے مجھ سے وہ جگہ خالی کرنے کو کہا۔ اس کا کیا دوش! شوہر اس کا فدائی ہے اور پہلے ہی جیل میں ہے۔تم ہوتے تو کیا کرتے؟

''میں سمجھتا ہوں لیکن تم ذرا اور ٹھہر جاتے۔''

''سیدھی سی بات ہے۔مجھ سے زیادہ نہیں سہا جائے گا۔اب الال کو دیکھ لو۔

میں نے سوچا تھا وہ کبھی نہیں قبولے گا۔جب بھی ہم اس صورت حال پر بات چیت کرتے تو گاڑی چلاتے چلاتے اس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا اور جسم اکڑ جاتا اور جب ہم سامراجیوں کے کھیتوں کے پاس سے گزر جاتے تو وہ اس قدر طیش میں آتا کی گاڑی سڑک سے اتر جاتی۔''یہ سب تمہاری اور میری ملکیت ہے''۔وہ ہمیشہ کہتا''اور دیکھو ان فرنگیوں کی زندگی کیسے مزے میں گزر رہی ہے اور ہماری زندگیاں کولا کے ڈبے ڈھوتے گزر رہی ہیں''۔جب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ان کی فصلوں کو آگ لگا دیں گے اور ہم تم سے صلاح مانگنے آیا کرتے تھے تو مجھے یقین تھا اور الال بھی یہی کہا کرتا تھا کہ میں آئے دن مرنے والے ان سینکڑوں لوگوں سے زیادہ موت کا مستحق ہوں،کیونکہ مجھے ان سے بہتر طور پر یہ علم ہے کہ''مراکش''کے معنی کیا ہیں۔لیکن مجھے قید خانے سے ڈر لگتا ہے۔وہ مجھے جانتا ہے اور میں تمہیں جانتا ہوں۔''

اس کی آواز میں خطرہ کی گونج تھی۔ہمارا اضطراب بڑھتا گیا اور بے چارگی کے

سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ ذرا سی دیر میں ہماری بلڈنگ کے دروازے پر کسی کے ٹھوکریں مارنے کی آواز آئی۔ اگر اس وقت میرے مرحوم نانا چلے آتے تو میں اتنی سراسیمہ نہ ہوتی۔ مارے گھبراہٹ کے ہم کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگے۔

''میں کہاں چھپوں''۔ فقیہ گڑگڑایا۔

''پلنگ کے نیچے۔''

میرا شوہر دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول دیا۔ فقیہہ چھلانگ مار کر اندھیرے میں بڑھا۔ میرا شوہر اسے پکڑنے کو لپکا ''تم کہاں جا رہے ہو؟

''چھت پر''

''اور ان فوجیوں کے متعلق کیا خیال ہے؟''

گھبراہٹ میں وہ انہیں بھول گیا تھا۔ وہ غیر ملکی فوجیوں کا دستہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ واقعی سینگالی تھے یا ان کے سیاہ فام ہونے کی وجہ سے ان کا یہ نام پڑ گیا تھا۔ بہر حال غیر معمولی حاضر دماغی سے کام لیکر میرے شوہر نے فقیہ کی جان بچالی۔ یہ دستے رات کو شہر کی عمارتوں پر چھاؤنی ڈال لیتے تھے۔

فقیہہ اندر پلٹ آیا۔ میرے شوہر نے سیڑھیاں اترنا شروع کیں روشنی کے لئے وہ ماچس کی تیلیاں جلاتا گیا۔ اس نے صدر دروازہ کھولا اور ہم نے یہ گفتگو سنی۔

''کون رہتا ہے اس بلڈنگ میں؟''

''صرف میں''۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

اس نے اپنا نام بتا دیا۔ اتنے میں کوئی بولا۔ یہ جگہ غلط ہے۔ ہمیں تو سڑک پار والی بلڈنگ میں جانا ہے۔ دروازہ دھڑ سے بند ہوا اور ہم اندھیرے میں ساکت کھڑے رہے۔ ایسا معجزہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ہم خاموشی سے ڈرائنگ روم میں واپس آ گئے۔ باہر ایک آنسو بھری کمزور آواز گڑگڑا کر کہہ رہی تھی ''مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے؟'' ہم لپک کر دروازے کے ساتھ جا چپکے اور ایک دوسرے کو دھکیل کر جھریوں سے دیکھنے لگے۔ وہ ایک عورت کو بے نقاب ہی باہر لے آئے تھے۔ ان کی ڈھیر سی ٹوپیوں کے بیچ میں ہم اس کے ہونے کا اندازہ ہی لگا سکتے تھے۔ سڑک پر سناٹا تھا اور ایسا لگا جیسے ساری

بند کھڑکیاں، کھڑکیاں نہ ہوں آنکھیں ہوں۔ ''مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے؟''

ان میں سے ایک نے اس کے تھپڑ رسید کیا معارف میں (کیسا بلانکا کا پولیس ہیڈ کوارٹر) تمہیں معلوم ہو جائے گا۔اس کا تلفظ فرانسیسی تھا۔

''وہ اپنے غم زاد کے گھر ہے''۔اس نے یہ لفظ ایسے کہے جیسے اس نے انجانے میں دہکتا انگارہ اٹھا لیا ہو۔انہوں نے اسے گھسیٹ کر جیپ میں ڈالا اور زن سے نکل گئے ۔ جیسے ہی جیپ کی آواز دور ہوئی ہم نے اس عورت کے گھر سے بچوں کے رونے کی آواز سنی اتنے میں ایک گشتی دستہ گلی کے سرے پر نظر آیا۔ ان کے بوٹوں کی دھمک میں بچوں کی چیخیں دب گئیں۔

ایک بے یقینی کے عالم میں ہم کھڑکی سے ہٹ آئے ۔اس منظر کا باعث کون سی طاقت تھی؟ یہ معجزوں کی رات تھی۔ہم بھونچکے سے بیٹھے تھے کہ میرے شوہر نے فقیہ سے کہا''اور تم اپنے آپ کو حوالے کرنے جا رہے ہو۔ کچھ دیکھا تم نے ایک تھپڑ کی مار میں اس نے اگل دیا کہ اس کا میاں کہاں ہے؟''

ایک لحہ کو فقیہ کے چہرے پر نفرت اور بیزاری لہرائی اور اس کا گہرا رنگ پیلا پڑ گیا۔کھدرے اونی جلابے میں اس کا چھوٹا سا سر کچھوے کا سا لگ رہا تھا۔موم بتی کی روشنی میں دیوار پر اس کا سایہ پڑ رہا تھا۔اس نے کہا''میں کوڑے نہیں کھا سکتا۔میں یہ بتائے دے رہا ہوں''۔ یہ دھمکی تھی یا مدد کی التجا۔''میں قبول دوں گا'۔ پاگل شخص۔وہ بھول رہا ہے کہ ایک فرد ہمیشہ گروپ کے لئے جان دے دیتا ہے۔جیسے ذرا پہلے وہ ہسپانوی کو بھول گیا تھا۔''میں انہیں تمہارا نام بھی بتا دوں گا اور اس عورت کبھی جس نے مجھے چھپا رکھا تھا''۔

میرے شوہر کی بیزاری بڑھتی رہی اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فقیہ کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے۔مگر وہ کھڑا اسے گھورتا رہا آخر فقیہ رو پڑا۔ یہ درست ہے کہ کمزوری ہمیشہ جلد بازی کو ہوا دیتی ہے۔''میرے لئے کوئی راستہ نکالو'۔ ہارا ہوا فقیہ گڑگڑا رہا تھا۔

''ہم نکالیں گے''۔

وہ رات میں بڑے ہیجان میں گزاری۔ جیسے ہی کرفیو اٹھا میرا شوہر گھر سے چلا گیا۔جب وہ واپس پلٹا تو میں باورچی خانہ میں تھی۔'' وہ تمہارے ساتھ،عورت کے

بہروپ میں سوق العربہ تک جائے گا۔ صبح ہاٹ لگے گا۔ راحل پنساری کا پتہ پوچھنا۔ وہ لمبا اور دبلا سا ہے وہ ڈھیلی ڈھالی پتلون اور مشرقی طرز کی پگڑی پہنتا ہے۔ اس کے الٹے ہاتھ کی انگلی ایسے ہے جیسے کوئی گلٹی۔

میں جلدی سے تیار ہوئی۔ اور فقیہ کے لئے نقاب اور چغہ لے آئی۔ وہ فقیہ کی ٹانگ لگانے میں مصروف تھے۔ ''راحل تمہیں آج رات بارڈر پار ہسپانوی علاقے میں پہنچنے میں مدد دے گا۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور فقیہ کو تھما دیئے۔ ہم نے مل کر اپنے چغہ اور نقاب پہننے میں مدد دی اور پھر روانہ ہوگئے۔

ہم بس میں سوار ہوئے اور میرے شوہر نے ہمیں الوداع کہا۔ لیکن بس چلی نہیں۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کی دیر ہوسکتی ہے شاید ایک دن یا دو دن بھی۔ نو آبادیاتی ملکوں میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ لوگوں نے شور مچانا شروع کیا۔ ایک آدمی رجسٹر لئے آیا تو بس کے پچھلے حصے سے ایک جوان نے پوچھا ''تم ہمیں کب جانے دو گے؟''

''جب اللہ کو منظور ہوا''۔ آدمی نے تحکمانہ انداز میں لڑکے کو دھمکاتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ صورت ہے تو پھر بس کی روانگی کا وقت مقرر کرنے کی زحمت کیوں فرمائی؟'' مجھے اسی بات سے ڈر لگ رہا تھا۔ ساری بس کی آنکھیں ان دو پر گڑی ہوئی تھیں۔ ان کی لڑائی کے انتظار میں۔ یہ وہی لوگ تھے جو ذرا دیر پہلے چلنے کو بے چین تھے کسی نے لاحول نہیں پڑھی کہ دونوں حریف کچھ ٹھنڈے پڑتے۔ حتیٰ کہ مجھ سے نہ رہا گیا۔ وہ مرد جیسے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے رجسٹر کو سینے سے لگایا اور بس سے نیچے اتر گیا۔

''جب جائیں گے تب جائیں گے'' ایک عورت بولی ''ایک دو گھنٹہ کی کیا بات ہے''۔

''پھر تو ہمیں سامراجیوں کی ضرورت ہوگی''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

مسافر خفگی سے کچھ بڑبڑائے۔ لیکن اس سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کنڈیکٹر نے بس کی داہنی طرف سے کور ہٹا دیا۔ خوانچہ فروشوں نے جس مستقل مزاجی سے اپنا سودا بیچنا شروع کیا خوانچہ فروش اس کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ یہاں تک کہ بس اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔ بیرکوں، دستوں اور ان مزدوروں کو پیچھے چھوڑتی گئی جو دیواروں پر سامراج کے خلاف لکھے نعروں کو قلعی سے مٹا رہے تھے۔

فقیہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔غور سے گلیوں، راہ چلتوں ،دوکانوں کو دیکھتا، جیسے بس سے باہر جو کچھ بھی تھا اسے آنکھوں سے پی جائے گا۔اس کا جی لوگوں اور روزمرہ زندگی کے لئے مچل رہا تھا۔زینہ کے نیچے کی ایک تنگ کوٹھڑی میں ایک مہینہ کی تنہائی کاٹنے کے بعد اسے ہر چیز کو بصورت اور دلاویز لگ رہی تھی۔اس کا سون جاگنا سب بے وقت تھا۔ساری ساری رات ریڈیو کی سوئی گھماتے گزر جاتی۔ایک جلتے سگریٹ کے سوا باقی سب اندھیرا۔جیسے ہی سورج نکلتا اسے کمرے کے ہونے کا احساس ہوتا اور گلی سے جاگتی ہوئی زندگی کی آوازیں سنتا۔

بعد میں جب وہ ان دنوں کو یاد کرتا تو اپنی سیاسی حس کو ہمیشہ بہت اہمیت دیتا۔ میں نے ریڈیو پر گانے کے ایک نئے پروگرام کا اعلان سنا۔نئی آوازوں کی تلاش تھی اور پورے ملک میں اس کا اعلان کیا جاتا تھا''۔وہ یہ بات بھی نہ بھولتا۔انہوں نے اس کا نام نوجوان گیت رکھا تھا۔جوانوں کے گیت؟ جب انہیں بندوق اٹھانا سکھا رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اصل مقصد نوجوانوں کی توجہ ہٹانا تھا۔میرا اندازہ صحیح نکلا جب رقیہ مجھ سے ملنے آئی اور اس نے بتایا کہ پہلے ہی شو کے موقع پر رباط کے الحمرا سینما ہال میں بم کا دھماکہ ہوا ہے۔میں نے اس سے کہا مجھے یہ بات پہلے ہی معلوم تھی۔رقیہ نے خبر دی کہ وہ اسے دہشت پسندی کا کام کہتے تھے۔''وہ دہشت پسند کہتے ہیں'' میں نے جواب دیا تھا۔'' حالانکہ دہشت پسندی کی جڑ وہ خود ہیں۔وہ جب بھی یہ قصہ سناتا، اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہتا اور بہت خوش اور مگن لگتا۔'' ہے نا رقیہ؟'' وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتی وہ اور ترنگ میں آجاتا۔

بس میں سوق العربہ جاتے ہوئے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی اس لئے کوئی اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔میں اتنا جانتی تھی وہ خوفزدہ تھا۔اپنی زندگی کے لئے۔ اس کے رنج کے احترام میں میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ہم دونوں اپنے اپنے وسوسوں میں گم تھے ہماری خاموشی نے ہمارے دکھ میں اضافہ کر دیا تھا--

رباط کی طرف ہم ابھی تھوڑا آگے گئے تھے کہ سڑک کے دونوں طرف سرخ مٹی میں اگی انگوروں کی بیلیں نظر آنے لگیں اور ان کے درمیان سرخ چھتوں والے گھر۔بس آہستہ ہوئی اور پھر سڑک کے کنارے رک گئی۔جیسے ہی انجن بند ہوا مسافروں نے سر باہر

نکال نکال کر دیکھنا شروع کیا۔ کچھ اچک اچک کر دیکھنے لگے کہ کیا ہوا۔

''انجن خراب ہوگیا''۔

''تلاشی ہوگی''۔

''ٹریفک جام''

میرے اندر خوف تیر رہا تھا پھر بھی میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔ آخر کار ڈرائیور نے مڑ کر کہا ''فوجی کانوائے گزر رہا ہے''۔ میں نے چین کا سانس لیا۔ کچھ مسافر باہر نکل کر ٹہلنے لگے اور اسلحہ سے لیس فوجیوں کی لاریاں گزرتی چلی گئیں۔ ایک مسافر کھڑکی کے شیشہ سے منہ لگائے ان کو کوستا رہا۔

جیسے ہی کانوائے گزر چکا ڈرائیور نے ہارن بجایا اور مسافر انگوروں کی بیلوں سے برآمد ہونا شروع ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں شاداب انگوروں کے خوشے تھے۔ ٹماٹروں کے کھیتوں کو پیچھے چھوڑتی بس چلتی گئی، یہاں تک کہ ہم رباط کے مضافات تک پہنچ گئے۔ شہر سے گزرتے ہوئے صفائی ستھرائی دیکھ کر جی کھل اٹھا۔ عمارتوں کی قلعی، سرسبز درخت اور گھنی باڑیں گھروں اور سرکاری عمارتوں کا حسن بڑھا رہی تھیں۔ بحر اوقیانوس کے ساحل پر یورپی مراکشی ہیرا۔

جدوجہد میں جب میں کتابچے بانٹتی پھرتی تھی تب میں نے اس شہر کو اچھی طرح پہچانا۔ یہ ایک چھوٹا سا مگر پروقار شہر تھا۔ تین چیزیں آج بھی اس کی نشانی کے طور پر ذہن میں ثبت ہیں۔ مشہور دریا اور پرانا شہر۔ محور ایک بڑا سا میدان تھا۔ جہاں پیڑوں تلے گھاس اگی تھی۔ شہر کے لوگوں کی دل پسند جگہ۔ جہاں جمعہ کے جمعہ وہ پکنک منانے آتے اور مسجد کو جاتے، شاہی جلوس کا نظارا کرتے۔ دریائے رباط کی خصوصیت وہ پل تھا۔ جس پر سارا دن چھوٹی چھوٹی بسیں کیڑوں کی طرح رینگتی آتی جاتی رہتیں۔ شہر سے دریا کے کنارے تک مسافروں کو لانے لے جانے کے لئے چند پیسوں کے عوض۔ اور پرانا شہر وہ تب بھی اور آنے والے زمانوں میں بھی اپنی دیواروں کے حصار میں ایک بیج کی طرح پوشیدہ رہے گا۔ گلیوں کی وہ بھول بھلیاں بھی جن کا پتہ نہیں چلتا کہ ایک کہاں ختم ہوئی اور دوسری کہاں شروع۔

ان دنوں رباط مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور مجھے لگتا ہے میرا اس کا ایک قریبی تعلق

ہے۔میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ تعلق ایک دن اس قدر تکلیف دہ ہو جائے گا۔ان دنوں میں کتابچے بانٹنے آیا کرتی تھی ۔مہینہ میں ایک بار تو ضرور کبھی تو اسی دن واپس ہو جاتی اور کبھی حاجی علی کے ہاں رات گزارتی۔وہ بھی ایک کٹر وطن پرست تھا۔بہت خوش مزاج اور اپنے پیشے میں ماہر لوہار تھا۔اپنی مہارت سے اس خوش رہتا جیسے اس کی دھونکنی کے نیچے دہکتے انگارے اپنے پیشے اور اپنے وطن سے محبت ایک ہی چیز تھی۔

کتابچے بانٹنے اور سنٹرل جیل کے قیدیوں کے لئے کھانا پکانے کے علاوہ اور بھی بہت سی خفیہ مصروفیتیں تھیں۔آزادی کے بعد جنوبی صوبوں میں سے ایک میں اسے قائد مقرر کر دیا گیا تھا۔یہ عہدہ اور بھی بہت سے لوگوں کو ملا تھا جنہیں میں جانتی تھی اور جن میں سے ایک فقیہ بھی تھا۔مگر یہ قصہ بعد کا ہے۔

سامراج کے عہد میں قائد ایک قبیلہ کا سردار ہوتا تھا اور شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔وہ جاگیردار طبقہ کا فرد سمجھا جاتا تھا۔لوگوں کی املاک اور زندگیوں پر اختیار میں صوبائی حکومت ان کے ساتھ شریک تھی۔حکومت کا یہ خیال تھا کہ طاقت کی اس تقسیم سے وہ قومی اتحاد کو کمزور کر سکے گی اور مرکزی حکومت کے منصوبوں کو ناکام بھی۔قائد ایک بڑا نام تھا۔جس سے لوگوں کے ذہن میں دولت ، طاقت اور خوف کا تصور وابستہ تھا۔اب یہ لفظ وزارت داخلہ کے ایک عہدہ کا نام ہے۔جو میئر کے برابر کا ہے۔پر آزادی کے ابتدائی دنوں میں اس سے بڑی عزت وابستہ تھی۔

حاجی علی پر اس کا کیا اثر ہوتا۔وہ مرتبہ کی اس اچانک تبدیلی کے لئے خود کو کیونکر تیار کرتا۔آخری بار جب ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ مایوس اور مضطرب تھا۔اس کی ساری خوشی آگ کی طرح ٹھنڈی ہو چکی تھی جیسی کہ رباط کے پرانے شہر میں اس کی بھٹی کی آگ۔

اس کی خوش مزاجی کہاں گئی؟اس کا ارادہ اس کی قوت؟اس دن مجھ پر یہ کھلا کہ انسان کے اصولوں کی طرح اس کی روحانی طمانیت بھی ایک بڑی نازک ملکیت ہے۔جیسا کہ بعد میں درگاہ کے شیخ نے کہا تھا۔

ہم اس سے ملنے جنوب پھر کبھی نہیں گئے ۔جیسے ہی وطن پرستی کی تحریک ختم ہوئی ہم لوگ اختلاف رائے کی بدولت ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہے ہم خیال ایک

دوسرے کے دشمن ہوئے تو دوستی کا وہ ساتھ بھی جسے ہم نے زندگی بھر کا ساتھ سمجھا تھا ایک بھونڈے طریقے سے ختم ہو گیا۔ سیاست کیسی بری چیز ہے۔ لوگوں کو جدا کر دیتی ہے اور وہ سب کچھ حاصل کر لیتی ہے جو شیطان سے بھی ممکن نہیں۔ ہماری راہوں کا الگ ہو جانا مقدر تھا۔ لوگ بدل گئے تھے۔ دوستی اور محبت کے وہ تعلق بھی جنھوں نے ہمیں حاجی علی کے خاندان سے منسوب کر دیا تھا۔

تقرری کے ایک سال بعد پتہ چلا کہ اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ہم لوگ حیران رہ گئے۔ ایسی انہونی وہ کیونکر کر سکتا تھا۔ ہم ان دنوں رباط میں رہتے تھے۔ میں اس کی کھوج میں پرانے شہر گئی اور گلیوں چلتی چلی۔ اس کی دوکان کے پاس پہنچی تو دروازہ کھلا تھا۔ قریب جانے پر ہتھوڑے کی مسلسل دھمک تیز ہوتی گئی۔ حاجی علی اور اس کے ساتھی باری باری گرم انگارہ لوہا ڈھال رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بازو سے ماتھا پونچھتا ملنے کو آگے بڑھا۔ چمڑے کی ایپرن کے پیچھے میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرہ پسینہ سے تر تھا۔ اس کی ہنسی میں ایسی خوش دلی اور سچائی تھی جیسی کہ اس وقت گھر واپس آنے پر کسی مرد کے چہرہ پر ہو جب وہ بیوی سے لڑ کر چلا جائے۔

دھکتی آگ، اڑتی چنگاریوں اور دھونکنی کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں بیوی سے صلح کرنے والے شوہر کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ جنوب میں جب پہلے اس سے ملے تھے تو اس کا حال ایسے تھا جیسے کوئی معمولی آدمی انتہائی قیمتی لباس میں پابند ہو اور جو صرف اپنے روزمرہ کے معمولی کپڑوں میں خوش اور آزاد محسوس کرے۔ قائد کے اہم عہدے کے بعد دوبارہ لوہار کے کاروبار میں مصروف ہونے پر اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی، بلکہ اپنی دوکان میں وہ جس اعتماد سے مصروف رہتا، وہ صحیح معنوں میں قائد نظر آتا تھا۔

رباط سے روانہ ہونے سے پہلے بس میں ایک آدمی سوار ہوا اس کی داڑھی الجھی ہوئی تھی اور سر پر انگوچھا لپیٹے ہوئے تھا۔ اپنے پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر وہ کریہہ آواز میں گا رہا تھا اور جھانجھ پیٹتا جا رہا تھا۔ انجن میں اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ ہوئی وہ بس میں پیچھے تک چلتا گیا اور اپنے پیسے اکٹھے کرتا رہا۔ بس کی رفتار تیز ہونے پر اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور سڑک پر کود گیا۔

قنیطرہ میں بس رکی۔ ہم نے ایک پانی والے سے پانی خرید کر پیا۔ قنیطرہ کے

بعد ہم غرب کے میدان میں پہنچے اور دریا پار کیا۔ یہ دریا اپنے سالان سیلاب کے لئے مشہور ہے۔ وہ پیڑوں کے جھنڈ میں کھیت اور سنتروں کے باغ گزرتے گئے حتیٰ کہ ہم سوق العربہ پہنچ گئے۔ یہاں ہم بس سے اترے بس مسافروں کو لے کر سرحد اور طنج کی طرف بڑھ گئی۔

اترتے ہی ہم نے ادھر ادھر دیکھا ذرا دور بازار نظر پڑا۔ گرد آلود میدان سے گزرتے ہوئے گھوڑا گاڑیوں پر سور مسافر ہمیں پیچھے چھوڑ گئے۔ ایک لینڈ روور بھی گزری جس پر اسپرو کا ٹریڈ مارک تھا اور موسیقی زور زور سے بج رہی تھی۔ اس کے پیچھے دھول کی ایک لکیر اور بچوں کا غول تھا۔ جو اسپرو کا ہیٹ ملنے کی امید میں اپنی ہمت سے زیادہ تیز دوڑ رہے تھے۔ بچے لینڈ روور کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے یہاں تک کہ وہ بازار تک پہنچ گئی۔ اسپرو کے ہیٹ اوڑھے وہ واپس مڑے۔ ہم ابھی تک راستے ہی میں تھے۔ بازار میں آگ برس رہی تھی۔ دھول اور گرمی کے باوجود لوگ اپنے کاموں میں جوش وخروش سے مصروف تھے۔ جیسے کہ یہ تپش اور دھول بازار کا اصل لطف ہوں۔ کیسے کیسے لوگ ہم نے وہاں دیکھے۔ ایک نقاب پوش خوش بیان عورت کیڑے مار دوائیں بیچ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اس کی تصویر آج بھی بڑی واضح ہے۔ میرا تو ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ خوش بیانی اور بے علمی دونوں متضاد ہیں۔ ایک مٹھائی بیچنے والا بھیڑ میں آوازیں لگاتا پھر رہا تھا۔ ''مولائے درلیس'' ایک اور پھیری والا رنگین کمبل اوڑھے اپنی چیزیں بیچ رہا تھا۔ ذرا آگے گئے تو ہم ایک پنساری کی چھولداری کے سامنے کھڑے ہو گئے جہاں ایک بڑھیا کالے موتی خرید رہی تھی۔ دوکاندار گولف کی سی پتلون پہنے ہوئے تھا اور تیز زرد رنگ کی ریشمی پگڑی باندھے تھا۔ ''اماں یہ پیسے کم ہیں'' وہ عورت کو بتا رہا تھا پگڑی ہٹا کر اس نے اپنے الٹے ہاتھ سے گنجے سر سے پسینہ پونچھا۔ میں نے اور فقیہ نے اس کی چھٹی انگلی دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

عورت نے موتی واپس کر دیئے۔ ''سنوراحل'' وہ بولی۔ ٹھیک ہے یہ ہمارا ہی آدمی ہے۔ ''اٹھارہ اور بس'' اس نے کاپی کے ایک ورق کی پڑیا میں موتی لپیٹے اور عورت کو دے دیئے اور ہماری طرف پلٹا۔ میں نے اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مصالحہ کی الماری پر سے آگے کو جھکا۔ ''ہم کیسا بلا ناکا سے تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں'' میں نے کہا۔ وہ

سیدھا کھڑا ہوگیا۔''سامنے انجیر کے پیڑ کے نیچے میرا انتظار کرو''۔

پیڑ کی چھاؤں میں ہم نے کھانا کھایا اور پروا ہوا کے مزے لئے۔ہم بازار کے رنگ اور تماشے دیکھتے رہے۔جب تک کہ سورج غروب اور لوگ جانا نہ شروع ہو گئے۔

جب راحل اپنے خچر کے پیچھے پیچھے چلتا آیا تو بازار خالی ہو چکا تھا۔ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔ہمارا رخ مشرق کی طرف تھا اور ہمارے گرد گندم کے کھیت تھے جہاں کٹائی ہو چکی تھی اور جہاں بھوسہ کے گٹھے اور گندم کے ڈھیر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔گھروں کو پلٹنے والوں کو لے کر گھوڑا گاڑیاں گزرتی رہیں۔ہمارے ارد گرد ایک مدھم سی روشنی پھیلتی تھی۔شام کی خاموشی میں بھیڑوں کے ممیانے کی آواز دور تک سنائی دیتی۔یہ سکون خدا کی قدرت کی شان کا مظہر تھا۔سیاست کی ساری کوفت اس نے دھو ڈالی تھی۔ہمارے چاروں طرف دور دور تک پھیلا ہوا میدان تھا اور لگتا تھا جیسے فقیہ، راحل میں اور خچر کسی اور دنیا کے رہنے والے ہوں۔

''ہم آ گئے''راحل کی آواز نے مجھے چونکا دیا ہمارے سامنے ایک سفید مکان تھا جس کے گرد کیکٹس کی باڑ لگی ہوئی تھی۔بچوں کا ایک غول اور کیچڑ میں لتھڑے تین کتے ہمارے استقبال کو دوڑتے آئے۔راحل نے کتوں کو چپ کرایا اور بچوں سے کہا ہمیں سلام کریں۔بچوں نے ہمارے ہاتھ چومے۔کتوں نے بھونکنا بند کر دیا اور سر نیہوڑائے سب کے ساتھ چلنے لگے اور یہ چھوٹا سا جلوس گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

گھر کا دروازہ چوڑا چکلا تھا۔بڑے سے کچے صحن میں چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔گردا گرد کمرے بنے ہوئے تھے۔جیسے گاؤں کے بازار میں دوکانیں ہوں۔ایک طرف تندور لگا تھا اور اس کے ساتھ بنی ایک ناند چارہ سے بھری تھی۔تھوڑا جھکی اور پھر اپنا ہاتھ ہمارے طرف پھیلا کر انگلیاں اپنے ہونٹوں سے لگالیں۔خچر سے سامان اتارنے میں وہ راحل کی مدد کرنے لگی۔پھر اس نے ہمارے جلابے ہم سے لئے۔میں نے اسے فقیہ سے جلابہ لیتے دیکھا وہ ذرہ برابر حیران نہیں ہوئی۔جیسے یہ معاملہ پہلی دفعہ نہ ہوا ہو، اور وہ کئی دفعہ مردوں کو عورتوں کا بہروپ بھرے دیکھ چکی ہو۔

ہم نے گرمی کے مارے کھانا چھت پر کھایا۔چاند نے رات کو روشن کیا اور ابھی ایک اکیلا تارا چمک رہا تھا۔ہم سب چپ بیٹھے تھے کہ راحل نے کہا''قہوہ ہم جب پئیں

گے جب آزادی مل جائے گی ۔ پیئے بغیر ہم مر نہیں گئے ۔ہم نے فرانسیسی چیزوں کے بائیکاٹ کی خاطر چائے پینا چھوڑ دی تھی ۔ہم نے ایک کمیٹی بنالی تھی ۔رقیہ،صفیہ، میں اور میرا شوہر۔ جمعہ کی اذان ہوتی تو ہم قرآن پاک کھول کر بیٹھتے اور قسم کھاتے کہ جب تک فرانسیسی چلے نہیں جائیں گے ہم چائے نہیں پئیں گے ۔ بائیکاٹ تو ویسے ہی قائم رہتا لیکن اپنی تسلی کے لئے ہم یہ قاعدہ دہرایا کرتے ۔

''تو کیا ہم مر گئے اس کے بغیر؟''

نہیں، ہم نہیں مرے ۔آسمان ستارے ٹکا لحاف لگنے لگا ۔فقیہ بھیڑ کی کھال پر لیٹ گیا---اس کی آنکھیں کھیتوں سے پرے پھولوں سے لدے پیڑوں پر جمی تھیں، جو چاندنی میں نظر آرہے تھے ۔ میں اور راحل دونوں اسے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا'' راحل بولا''خود دیکھ لو گے''۔

خاموشی نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس خوبصورت شام میں صرف ٹڈیوں کی چھک چھک کی آواز تھی ۔کہیں دور سے بھونکنے کی آواز آئی اور راحل کے کتوں نے فوراً جواب آں غزل ارشاد کیا۔

''میرے ملک پر غیر ملکیوں کی حکومت ہے''،فقیہ نے دکھ سے کہا''اور میں ایک جگہ سے دوسری پناہ ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں ۔ٹڈیاں اپنی چک چک میں اور پھول کھلنے میں مگن ہیں''۔

ہم سب میں سے کوئی کچھ نہ بولا ایسا لگا جیسے بہت دیر ہو گئی ہو، راحل اٹھا اور ہم سب بھی ۔ہم گھر سے باہر آئے ،راحل خچر لے کر آیا۔فقیہ کو سوار ہونے میں مدد دی ۔ پھر خود بھی سوار ہوا اور دونوں مرد رخصت ہو گئے ۔کیکٹس کی باڑ کے ساتھ لگے ہم دونوں انہیں جاتا دیکھتے رہے ۔عورت کولہے پر بچے کو اٹھائے تھی ۔حتیٰ کہ وہ کھیتوں میں غائب ہو گئے ۔

بارش ہو رہی تھی اور رات پڑ چکی تھی جب میں اور شیخ درگاہ سے باہر نکل آئے ۔

'' دیکھو، بھولنا نہیں'' وہ اس وقت مجھ سے کہتے ہیں میں جب چلنے لگتی ہوں۔''کیا نہ بھولوں؟'' مجھے یہ یاد نہیں کہ ہم دونوں نے کیا طے کیا تھا۔

''اون کا تنا'' وہ مجھے یاد دلاتے ہیں

''ہاں ہاں، اچھا ضرور''۔

انہیں درگاہ کے دروازے میں قفل لگا تا چھوڑ کر میں بارش میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کرتی ہوں۔ میرے اردگرد لوگ یا تو بارش سے بچنے کو جگہ ڈھونڈھ رہے ہیں یا بھاگ کر رستہ طے کر رہے ہیں۔

حاجی علی، فقیہ، راحل، اس کی بیوی اور بہت سارے اور لوگ صفیہ، رقیہ، والٹر، آزادی کی لمبی مسافت میں ان سب سے ملاقات ہوئی اور مجھے یہ سب پیارے لگنے لگے۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔ ایسا وقت پھر نہیں آئے گا۔ جیسے ہی سامراج کی حکومت ختم ہوئی وہ سب بھی کہیں گم ہو گئے۔ نہیں یہ بات بھی بالکل صحیح نہیں ہے۔ میں حاجی علی سے ملی۔ فقیہ اور رقیہ مجھ سے ملنے رباط آئے۔ میرے شوہر کی بدسلوکی دیکھی اور پھر کبھی پلٹ کر نہ آئے۔ اب کوئی میرا پرسان حال نہیں۔ مگر انہیں کیا پتہ؟ اور اگر انہیں پتہ چل بھی جاتا تو کیا پھر بھی مجھ سے ملنے آتے اب جبکہ وہ شیخ قائد اور پاشا ہیں۔؟

وہ رات ہم نے چھت پر گزاری۔ صبح ہوتے ہم نے راحل کو واپس آتے دیکھا ''فقیہ نکل گیا''---اس نے جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے ہم سے کہا۔''اب تک تو وہ طنجہ پہنچ گیا ہوگا۔

''فقیہ ایک بار پھر طنجہ گیا۔ اس وقت وہ مراکش کا حصہ ہو چکا تھا۔ پرانی سرحد کا کسٹم ہاؤس اجڑ چکا تھا اور چوہوں کی وہاں راجدھانی تھی۔ لیکن اس صبح جب راحل اسے چھوڑ کر واپس آیا تو میرا دل دکھی تھا واپسی پر خوف نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ مجھے لگتا تھا اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ جب اس کی بیوی مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اس کو تسلی دی۔ ''رقیہ بالکل مت گھبراؤ۔ سلطان کی واپس ہوگی اور قابض فوجوں کی واپسی بھی۔ مگر میرے اپنے دل میں سینکڑوں وہم تھے۔

اس کے بعد سے میں اور رقیہ ہڑتالیں کراتے۔ چندہ جمع کرتے اور دونوں پڑھنا لکھنا سیکھتے۔ وہ دن میں کبھی بھول نہیں سکتی جب ہم دونوں نے پہناس کی دوکان جلائی تھی۔

اس دن ہم دونوں اپنے سیاہ جلابے اوڑھ کر نکلیں۔ ان دنوں ہم سلطان کی

جلاوطنی کے ماتم میں سیاہ رنگ پہنتے اور ہمیں اس دن کا انتظار تھا جب سلطان کی واپسی پر ہم سفید فاختائیں بن کر پھرا کریں گے۔ میرے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جس میں پٹرول کی ایک بوتل چھپا رکھی تھی۔ سامراجی ایجنٹوں کوٹھکانے لگانا ہمارا فرض تھا۔ ہم نے پہناس کو تنبیہہ کر دی تھی۔ وہ پھر بھی سگریٹ بیچنے سے باز نہیں آیا۔ ہسپانوی گلی میں عورتوں کا بھیڑ بھڑکا تھا۔ فٹ پاتھ پر سبزیوں کے کریٹ بھرے پڑے تھے۔ ہم سلاد بیچنے والی کے پاس رکے اور بھاؤ تاؤ میں جان بوجھ کر دیر لگاتے رہے۔ پنہاس وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کی ٹوپی ''ننھے مراکشی'' کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سڑک پار کر کے ہم اس کی دوکان تک پہنچے اور اندر چلے گئے۔ اس نے اخبار نیچے سرکایا تو اس کا داڑھی والا چہرہ سامنے تھا۔

''مجھے وہ بیگ دکھایئے'' رقیہ نے کہا۔ اس نے سیڑھی لگائی اور بیگ اتارنے کے لئے چڑھا۔ میں نے بوتل کو گردن سے پکڑا۔ اس کا کاک کھینچا اور بوتل ٹیڑھی کر دی۔ پٹرول ٹوکری میں گرتا رہا۔ میں نے ماچس کی تیلی سلگائی اور ٹوکری کو دوکان کے اندر ڈبوں اور تھیلوں کے درمیان پھینک دیا۔ پھر رقیہ کے پیچھے سرپٹ دوڑی۔ اسکا بھاری جسم زمین پر اٹھتا، ٹکتا دوڑ رہا تھا۔ میں ہلکی پھلکی تھی۔ ہوا کی طرح دوڑ رہی تھی، زمین پر جیسے میرے پیر لگتے ہی نہ ہوں۔ ہم کافی دور تک بھاگتے چلے گئے۔ ''دوڑتی چلی جاؤ، ورنہ وہ تمہیں پکڑ لیں گے''۔ لڑکیوں کے ایک گروپ نے آواز لگائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ان کا ہجوم ہمارے پیچھے تھا۔ ایک بالکل میرے پاس آ پہنچا اور میرے جلابے کو پکڑ کر کھینچا، اس کھینچا تانی میں جلابے کی ٹوپی پھٹ گئی۔ ایک بڑی سی ٹوکری پر میری ٹھوکر لگی۔ اس کے کنڈے میں میرا پیر پھنس گیا۔ پیر پھنسنے کے باوجود میرے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا حتیٰ کہ مجھے ایک گلی نظر آئی۔ میں سانس درست کرنے کو ذرا رکی۔ میرے الٹے ہاتھ پر ایک ریڑھی کھڑی تھی جس پر ایک پتیلی میں گھونگے ابل رہے تھے اور بہت سے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے مصالحوں کی دوکان تھی اور ایک ریسٹورنٹ جہاں حریرہ سوپ بکتا تھا۔ سیدھے ہاتھ ایک دروازہ تھا۔ تھوڑا سا کھلا ہوا۔ میں نے دروازہ کھولنے کو دھکیلا اور اندر گھس کر بند کر لیا۔ صحن میں کچھ عورتیں بیٹھی ترکاری بنا رہی تھیں۔ ''میں ایک گوریلا فدائی ہوں۔''

عورتیں جھٹ میرے ارد گرد جمع ہو گئیں۔ انہوں نے میرا جلابہ اور وہ ٹوکری جو میرے ساتھ گھسٹتی چلی آئی تھی کہیں چھپا دی اور مجھے اوپر کی منزل میں لے گئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے جھانکنے پر اپنا تعاقب کرنے والے مجھے نظر آرہے تھے۔ ان میں پہناس بھی تھا اور پولیس کا کتا بھی۔ وہ ایک دھجی کتے کو سنگھا رہے تھے۔ وہ میرے جلابے کی ٹوپی تھی میں عورتوں کی طرف مڑی اور بولی'' مجھے چلا جانا چاہئے۔ انہوں نے بڑی التجا کی کہ میں نہ جاؤں۔ میں پھر کھڑکی سے آن لگی۔ مردوں نے گلی کا ناکا روک رکھا تھا اور ان کے پیچھے بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ کتا گول گول گھومے جارہا تھا۔ کونا کونا سونگھتا۔ جیسے دیوانہ ہورہا ہو۔ جس شخص کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی ان نے گالیاں بکنا شروع کیں اور کتے کو گھسیٹ کر لے گیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔

''یہ کتا گدھا''۔ میں نے بڑی بے یقینی سے عورتوں سے کہا۔

''بے چارہ کتا ان ساری خوشبوؤں کے بیچ میں کیسے کھوج لگاتا۔ گھونگے حریرہ، مصالحے''۔ ایک عورت بولی۔ ہم سب ٹھٹھا مار کر ہنسے، جیسے اس طوفان میں اپنی گھبراہٹ ڈبونے کے لئے۔

میں ان میں سے ایک جلابہ اوڑھ کر نکلی۔ اپنا وہیں چھوڑا۔ میں پھر کبھی انہیں نہیں دیکھا۔

رقیہ مجھ سے پہلے گھر پہنچ گئی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی کہانیاں بڑے جوش و خروش سے سنائیں۔ کیا عورت تھی! اپنے خاوند سے کہیں زیادہ لائق اور اس سے کہیں زیادہ مستقل مزاج۔ اللہ نے انہیں میرے پاس بھیجا تاکہ اس راستے پر چل سکوں جہاں سے میں نے بہت کچھ پایا۔ پہناس کی دوکان جلانے میں ساتھ دینے کے بعد ایک کے بعد، ایک کام مجھے ملتا رہا۔ وہ سب کام میں نے تن تنہا کئے۔ میری نانی اگر کہیں سے پھر زندہ ہو جاتیں اور مجھے دوکانیں جلاتے، اسلحہ پہنچاتے، لوگوں کو سرحد پار کراتے دیکھ پاتیں تو ایک موت اور مر جاتیں۔ میرے نانا نانی کی بات تو چھوڑو کیا یہ سب میرے وہم و گمان میں بھی آسکتا تھا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ انہوں نے مجھے اور طرح کی زندگی بسر کرنے کی تربیت دی تھی، مگر تقدیر نے ان کے منصوبوں کا تمسخر اڑایا۔

''نہیں میں کسی کو جان سے نہیں ماروں گی''۔ ایک شام میں نے اس سے کہہ دیا۔ ''انہوں نے ایک نیا کام تمہیں سونپا ہے۔ تمہاری پچھلی کامیابی نے ثابت کر دیا ہے کہ اب تم ایسے کاموں کے لئے تیار ہو''۔ تاریکی میں اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''بندوقیں'' اس نے اپنے معمول کے اختصار کے ساتھ کہا۔

''نہیں، میں کسی کی جان نہیں لوں گی''۔

میری بات پر اسے غصہ آ گیا۔ مسکراہٹ کہیں گم ہوگئی اور اس کی جگہ غصہ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ''جان لینے کی بات کون کر رہا ہے؟'' اس نے اسی طرح بندھے ٹکے لہجے میں کہا۔ ''مردوں کا کام ہوتا ہے۔''

''سو، اس بات پر ہم متفق ہیں''۔ میرا اضطراب کم ہوا۔

بڑی دیر تک وہ چپ رہا، اپنا غصہ پینے کی خاطر۔ پھر ایک سانس لے کر ملائمت سے بولا جیسے صلح کر رہا ہو۔ ''وہ چاہتے ہیں تم خمسیت تک بندوقیں پہنچا دو''۔

''ہاں میں کروں گی''۔

اس نے ہدایتوں اور اطلاعوں کی مجھ پر بوچھاڑ کر دی۔ میرا دل ایک عجیب بے چینی سے برقرار ہو گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے آگ لگنے والے واقعہ کا تجربہ مجھ پر سے دوبارہ گزر رہا ہو۔ ساری رات خواب میں مجھے سیڑھی پر چڑھا پہناس، پولیس کا کتا اور بم کی طرح پھٹتی ٹوکری کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پھر مجھے وہ ٹوکری یاد آ گئی جس میں میرا پیر الجھ گیا تھا اور میں ہنس پڑی۔

''کس بات پر ہنس رہی ہو؟''

سناٹے کو چیرتی میری ہنسی کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ ''مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب میری ٹوپی پھٹ کر الگ ہوگئی اور میرا پیر ٹوکری میں الجھ گیا تھا''۔

''کل صبح دیکھ بھال لینا کہ پیر کہاں رکھ رہی ہو''۔ اس نے ہنسے بغیر جواب دیا اس کے بعد میں بھی کچھ نہ بولی اور بقیہ رات دعا مانگتے گزار دی کہ اگلے دن مجھے اپنے کام میں کامیابی ہو۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میرا ماتھا جل رہا تھا اور لگتا تھا جیسے فرش لرز رہا ہو۔ میں نے کمر پر پٹی باندھی۔ رومال میں لپٹے پستول اپنے بلاؤز میں چھپائے، مجھے اپنے نانا کا حضرت اسماء کا قصہ سنانا یاد آ گیا۔ کہ کس طرح وہ رسولؐ خدا اور اپنے والد سیدنا ابو بکر صدیقؓ کے واسطے کھانا لے کر جایا کرتی تھیں۔ جب ہجرت کے سفر میں وہ ایک غار میں دشمنوں سے چھپ گئے تھے۔ ''انہوں نے اپنی پٹی کو دو ٹکڑوں میں پھاڑا، ایک ٹکڑا کمر کے گرد لپیٹا اور دوسرے میں توشہ رکھا اور پھر مکہ سے چپکے سے نکل گئیں''۔ نانا رک کر گہری سانس لیتے اور میں ان کی ناک کو دیکھا کرتی۔ جب وہ رسولؐ خدا اور صحابہ کرام کی تعریف کرتے تو میری نظر ان کی داڑھی پر جم جاتی جوان کے بولنے کے ساتھ ساتھ ہلتی، اس کی جنبش میرے لئے لوری بن جاتی اور حضرت اسماء کے اس تصور پر ایک دھندلا سا پردہ پڑنے لگتا، جو قصہ سنتے سنتے میرے ذہن میں ابھر آتا تھا۔

موازنہ کے اس خیال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے خیال آیا کہ صدیوں سے جہاد یونہی ہوتا چلا آیا ہے اور عورتیں اسی طرح اس میں شریک رہی ہیں۔

خسمیت جاتے ہوئے میری طبیعت یوں لگ رہی تھی جیسے کسی بیاہ میں رات بھر رت جگا کیا ہو۔ میں راستہ بھر اونگھتی جاگتی رہی۔ مجھے کچھ خیال نہ تھا میں کہاں ہوں۔ مجھے لگتا جیسے فقیہ میرے ساتھ ہے۔ پھر میں نے لاحول پڑھنا شروع کر دی۔

خسمیت پہنچ کر میں کافی دور تک پیدل چلی پھر مجھے فرانسیسی میں چیخنے چلانے کی آواز آئی۔ میں دیکھنے کو مڑی تو سپاہی ایک ملٹی ٹرک سے کود کر اتر رہے تھے۔ کیا انہوں نے کیسا بلا نکا سے میرا پیچھا کیا ہے؟ میں نے چھو کر پستول دیکھے۔ سپاہی ہنستے چلاتے۔ ایک فرانسیسی کیفے کی طرف چلے گئے۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور چلتی گئی بس دو دفعہ پتہ پوچھنے کو رکی۔ میں اپنے ٹھکانے تک پہنچی تو میں نے دیکھا عمارت کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہیں اور بہت سی پولیس گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ میں نے پھر پستول چھو کر دیکھے اور ایک عورت سے جس کا جسم گدا ہوا تھا پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ ''فدائیوں نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا۔ اس کی تلاش میں پولیس ہر شخص کی تلاشی لے رہی ہے''۔ عورت نے مجھے بتلایا۔

''انہیں بھی اسے آج ہی اور اسی گھڑی مارنا تھا؟''

میں جدھر سے آئی تھی ادھر کو پلٹی، ادھر ادھر گھومتی رہی دیکھا تو پھر قتل کے موقع پر موجود تھی۔ سامنے سینما نظر آیا۔ میں ادھر کو بڑھی اور ٹکٹ خرید لیا۔ اندھیرے میں ایک جگہ اپنے لئے تلاش کی اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سیدھے ہاتھ پر ایک لڑکا فلم میں مگن بیٹھا تھا۔ الٹے ہاتھ کی نشست خالی تھی۔ اگر وہ سینما ہال کی تلاشی لینے آ جائیں تو کیا ہو؟

میں نے دونوں پستول زمین پر رکھے اپنی ایڑی سے انہیں کرسی کے نیچے کر دیا اور وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر مجمع چھٹ گیا تھا۔ ڈھکی لاش اسی طرح سڑک پر پڑی تھی، اس کا سر فٹ پاتھ پر ٹکا تھا۔ دور بیٹھی میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ اتنے میں لاش اٹھانے کو ایک ایمبولینس آئی۔ پولیس کی گاڑیاں بھی ایمبولینس کے پیچھے چلی گئیں۔ دیئے ہوئے پتہ کی سمت میں نے محتاط ہو کر چلنا شروع کیا۔ یہ تو ایک دوکان نکلی جہاں مقامی بنے ہوئے قالین اور دریاں بکتی تھیں۔ اندر بربریوں کے انداز میں پگڑی باندے ایک شخص بیٹھا تھا۔

''کیا تم ہی محبّ اللہ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میں ہی ہوں۔

''میں کیسا بلانکا سے تمہارے پاس آئی ہوں''۔

''میری طرف جھک کر وہ سرگوشی میں بولا'' تین پستول لے کر''

''جی''

''کہاں ہیں وہ''۔

''حفاظت سے ہیں''۔

وہ دوکان سے اٹھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لی۔ ہم مکانوں کے پیچھے ایک خالی جگہ تک پہنچ گئے۔ ''میں اس جگہ تمہارا انتظار کروں گا''۔

میں سینما واپس چلی گئی۔ مجھے میری نشست تک راستہ دکھایا گیا۔ میں نے پیروں سے بنڈل کو کرسی کے نیچے کھسکا کر نکالا۔ فلم ختم ہوئی۔ روشنیاں جل اٹھیں اور سب قطار اندر قطار باہر نکلنے لگے۔ میں سیدھی اس خالی جگہ تک پہنچی۔ اس نے مجھے دور سے دیکھ لیا اور ملنے کو آگے بڑھا۔ میں نے پستول اس کے حوالے کئے اور بس اسٹیشن کی طرف واپس چل پڑی۔

چوتھا باب

لنڈا بازار روز کی طرح لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ایسے ہی رہتا ہے۔ میری اماں کو یہ بازار خرید وفروخت کرنے کو بے حد پسند تھا۔ ان کا ذوق بھی نفیس تھا۔
میں کئی دفعہ اس کا چکر لگاتی ہوں۔ کاتنے کے لئے اون اور دوسرے لوازمات کی خاطر۔ میرے پاس جتنے پیسے ہیں سب خرچ کر ڈالتی ہوں اور مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میری زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں۔ میں بے فکری سے سر اٹھا کر دیکھتی ہوں۔ آسمان کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میں گہری سانس لیتی ہوں اور بلند آواز سے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔
میں خوش خوش گھر کو پلٹتی ہوں۔ فکر اس بات کی ہے کہ کہیں یہ خوشی بہت عارضی نہ ہو۔ اطمینان سے بیٹھ کر اپنی خریداری دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے اور اپنے اس نئے کاروبار کے سامان کے درمیان ایک تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ جب میں کام کرنا شروع کرتی ہوں تو مجھے اس کا نشہ ہو جاتا ہے۔ بغیر تھکے میں لگی رہتی ہوں جیسے میرے اور اس کاروبار کے درمیان ایک کوئی مقابلہ ہو رہا ہو۔
دکھ اور مایوسی کہاں گئی؟
لیکن کوئی چیز دائمی نہیں۔ نہ عمل نہ احساس۔ جیسے اس صبح دروازہ کھولنے پر سامنے ایک اجنبی کو پایا تھا اور یہ بات اب خواب اور ہذیان کی سی لگتی ہے۔ لیکن یہ یاد ہے کہ میں گھبرا سی گئی تھی۔ ''ڈرومت'' اس نے مجھ سے کہا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی ڈر لگنے لگا تھا'' میں رشید ہوں''۔ اس کا الجیرین ساتھی۔ ''انہوں نے آج صبح اسے گرفتار کرلیا۔
میں اسے گھورتی رہی، لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر تھپکا ''عورت بنو''۔

اس گھڑی کو میں نے اپنی زندگی کی سب سے منحوس گھڑی سمجھ تھا، اس دن تک جب میرے شوہر نے پلک جھپکے بغیر مجھ سے کہا تھا'' تمہارے کاغذات پہنچ جائیں گے اور وہ بھی جو قانوناً تمہارا حق ہے''

کمینہ آدمی۔ اگر اس وقت مجھے یہ پتہ ہوتا تو کبھی اس کے گرفتار ہونے کا ویسا غم نہ کرتی۔ مگر مجھے کیا خبر تھی۔ اپارٹمنٹ لوگوں سے بھر گیا تھا اور میں سر باندھے رکھ سے کپکپاتی رہی۔

انہوں نے اس پر ہڑتال کرانے کا الزام لگایا تھا۔ میں اس سے ملنے گئی اور اس کو پہچان نہ پائی۔ جیسے ہتھوڑے کار اس کے گال پچکائے گئے ہوں۔ جب اس کی طرف دیکھتی ہتھوڑا تصور میں ابھرتا درد اور تکلیف کے خیال سے میرا جی متلانے لگتا۔

میرے رب، کیا ہم کبھی بھول پائیں گے جو کچھ فرانس ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔

کیسی جلدی بھول گئے ہم۔ فرانس مسلسل ہماری سرکوبی کرتا رہا۔ میں سمجھتی تھی ہمارے درمیان خون کا دریا ہے جو کبھی پٹ نہیں پائے گا۔ مجھے تو سفارتی تعلقات، تجارتی معاہدوں اور لاکھوں مراکشی لوگوں کے فرانس کے شہروں میں مزدوری کرنے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ ایسی بات کون سوچ سکتا تھا؟ مگر آزادی کے بعد کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔'' ہم نے بھی انہیں نقصان پہنچایا''۔ جو قومیں دراصل بڑی ہوں، وہ ماضی کی طرف نہیں پلٹتیں۔

انہوں نے اسے سزا سنائی اور الغدیر کی جیل میں بھیج دیا۔ میں نے یہ نام سنا تو تھا، مگر یہ جگہ تھی کہاں اور وہاں کیسے پہنچا جا سکتا تھا۔ میں نے پتہ چلایا ایک دن علی الصبح رقیہ کو ساتھ لے کر چل پڑی۔ بس کمپنی کے ملازم نے اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر دیئے۔ ہم نے پیسے دینے پر جب بہت اصرار کیا تو اس نے کہا تمہارا شوہر اپنی زندگی سے یہ قیمت ادا کر رہا ہے۔ بس میں بھی وہ ہمارے پاس آیا اور ڈرائیور کو تاکید کی کہ ہمیں الغدیر پر اتار دے۔ دوسرے مسافروں نے ہمیں گھور کر دیکھ۔'' قیدیوں کی بیویاں''۔

بس نے ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف سفر کرنا شروع کیا۔ ہمارے سیدھے ہاتھ سمندر اور دوسری طرف کھیت اور چراگاہیں تھیں۔ کھیت لامتناہی تھے۔ اللہ کو کیا منظور تھا۔

''غرب اس کے بالکل دوسری جانب ہے۔'' میں نے رقیہ کو بتایا۔''سنگتروں سے لدا پھندا۔ کچھ ترکاریاں بھی مگر زیادہ تر سنگترے اور سیاہ زرخیز مٹی''۔

ہم مولائے شیب پہنچے۔ اپنے پیر کے نام سے موسوم چھوٹا سا شہر۔ اس کی قدیم دیواروں کے ساتھ بہتا ام رابع سمندر میں جا گرتا ہے۔ ہم شہر کے چوک میں رکتے ہیں۔ اترنے والے مسافروں نے چھت سے اپنا سامان اتارنا شروع کیا، جبکہ آگے جانے والے اتر کر کھانے پینے کو کچھ خریدنے لگتے ہیں۔ قلی نیا سامان چھت پر چڑھاتے ہیں بس شہر سے نکلی اور پھر کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلی جارہی تھی کہ ایک دم رک گئی۔

''وہ لوگ جن کو جیل جانا'' ڈرائیور نے آواز لگائی۔

ہم دونوں کئی دوسرے مردوں، عورتوں کے ساتھ نیچے اترے۔ کنڈیکٹر جلدی سے چھت پر چڑھ گیا اور ایک شخص کو جو سیڑھی پر کھڑا تھا ٹوکریاں پکڑانے لگا۔ وہ شخص ان ٹوکریوں کو اپنے سامان کے انتظار میں نیچے کھڑے لوگوں کو تھما دیتا۔ بس آگے بڑھ گئی اور میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ جنگل کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ مرد جتنا سامان اٹھا سکتے تھے اٹھا کر ایک چھوٹی سڑک سے اوپر چڑھنے لگے۔ باقی سامان اٹھا کر عورتیں ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ سڑک کے دونوں طرف سفیدے کے پیڑ تھے جن کے تنوں پر سفیدی کی گئی تھی۔ ہمارا یہ قافلہ راستے میں کئی بار رکا، عورتیں سامان پر بیٹھ کر ستانے لگیں مرد پتوں سے چھنتی دھوپ میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔

''کیا جیل کافی آگے ہے؟'' ہر دفعہ جب ہم ستاتے، میں یہی سوال کرتی۔

''بس سٹاپ سے سات کلومیٹر دور''۔ وہ جواب دیتے۔

سڑک کی چڑھائی ختم ہوئی اور سامنے ایک کھلا میدان نظر آنے لگا جہاں فاصلہ پر جیل نظر آنے لگی۔

''قیدی ابھی کھیتوں میں کام کر رہے ہیں''۔ جیسے ہی ہم پہنچے دروازے کے سنتری نے ہمیں بتایا۔''وہیں انتظار کرو''۔

پیڑوں کے سائے میں ہم بیٹھ گئے اور وہیں ہم نے پہلے ظہر اور پھر عصر کی نماز پڑھی۔ آخر کار قیدی ایک قطار میں کھیتوں کی طرف سے آتے دکھائی دیئے۔ ہم سب اپنے اپنے عزیزوں کا نام پکارتے ملنے کو دوڑ پڑے۔ مگر سنتریوں نے بڑھ کر ہمیں ان تک پہنچنے

سے روک دیا۔ایک رجسٹر منگایا گیا جس میں ہمارے نام درج تھے۔ایک ایک کر کے ہمارا نام پکارا گیا۔ہم ایک صحن میں پہنچے جہاں قیدی ایک سفید لائن کے پرے بیٹھے تھے۔ایک سنتری نے ہمیں بتایا کہ ہم جس قیدی سے ملنا چاہتے ہیں اس کے سامنے دوسری متوازی لائن کے پار بیٹھ جائیں۔

میرے شوہر نے مجھ سے فقیہ کے متعلق پوچھااور کچھ دوسری خبریں پوچھیں۔ایک سنتری ہمارے سر پا آن کھڑا ہوا اور ہم صرف ادھرادھر کی باتیں کرتے رہے۔میں نے اپنی ٹوکری کی چیزیں سنتری کو دیں اور اس نے انہیں میرے شوہر کو تھما دیا۔سنتری کے جاتے ہی میں نے پوچھا کہ میں اگلی دفعہ کیا لاؤں۔

''اگلے مہینہ سے پہلے مت آنا''۔اس نے جواب دیا۔''یہاں رہائش کا مسئلہ رہتا ہے''۔

''یہ تو ہم نے سوچا ہی نہ تھا''۔رقیہ نے کہا۔

''جیل کے پیچھے والٹر نامی ایک شخص تمہیں ملے گا'' میرا شوہر ہدایت دینے لگا۔

''وہ ایک جرمن سنتری ہے۔اس کی بیوی مراکشی ہے۔شتوکہ کی رہنے والی۔

''ایک فرنگی ہمارے لئے اپنے گھر کے دروازے کھول دے گا''۔میں نے بے یقینی سے کہا۔

''سب ایک سے نہیں ہوتے اور اسے تو مراکشی خاص طور پر پسند ہیں''۔

سیٹی کی آواز آئی۔سنتری نے آن کر اس سے کہا کہ وہ اندر جائے۔جیسے ہی وہ رخصت ہوا، پلٹا اور کہا'' کیسا بلانکا سے میری دعا کہنا''۔

ہم سب جیل کے دروازے سے باہر آ گئے۔ایک عورت اپنی سیاہ نقاب سے آنسو خشک کر رہی تھی۔عمارت کے پیچھے ہمیں والٹر ملا۔درمیانے قد کا گٹھا ہوا گورا چٹا آدمی۔

''محمد صاحب کا خاندان'' ہمیں دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

''جی'' ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک فرنگی سے کس طرح دوستی اور شناسائی کا رویہ رکھیں۔

''میرے ساتھ آیئے''۔

گندم کھیت میں ہم اس کے پیچھے چند قدم چلے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہر چیز خاموش تھی۔ سبز گندم کی بالیوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ کھیت کے دوسری طرف دو جھونپڑیوں کے سامنے مرغیاں دانہ چگ رہی تھیں۔ ''یا فاتنہ'' والٹر عربی میں پکارا۔

ایک دراز قد، گندمی چوڑی چکلی عورت ایک جھونپڑی میں سے نکلی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو بچیاں تھیں جو اپنے کپڑوں کے نیچے ڈھیلے ڈھالے روایتی لہنگے پہنے ہوئے تھیں۔

''مہمان'' وہ بولا۔

''سر آنکھوں پر'' عورت نے ہماری پذیرائی کو بڑھتے ہوئے کہا۔ ایک رسی سے بندھے کتے نے بھونکنا شروع کر دیا۔ دو قالی لہجہ میں عورت نے کتے کو چپ کرایا اور ہمیں جھونپڑی میں لے گئی۔ اس کے دروازے سے جھک کر گزرنا پڑا۔ اس نے کھمبے سے لٹکتی لالٹین جلائی۔ روشنی میں ایک چٹائی اور روغن کے کئی صندوق نظر آنے لگے۔ اس نے چٹائی پر ہمارے لئے قالین بچھایا اور چلی گئی ہم نے اپنے طلا بے اتارے۔ دھیان ہمارا ذرا دور جیل میں تھا۔ جس کی سلاخوں لگی کھڑکیاں شام کی بجھتی روشنی میں دھن لا گئی تھیں۔

فاتنہ ایک بچی کے ساتھ واپس آئی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ذبح کیا ہوا مرغ تھا۔ وہ اسے صاف کرنے لگی اور فاتنہ نے چولھا جلانا شروع کیا۔

تعلق خاطر میں گرم جوشی کے احساس نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اپنی چھوٹی بچیوں کا ہاتھ تھامے وہ شخص اندر آیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ دونوں گھٹنوں پر اس نے بچیاں بٹھالیں۔ اسے دیکھ کر میرے جذبات ملے جلے تھے۔ ایک نئی طرح کی شفقت جس میں سالوں کی تلخی اور غلط فہمیوں کا شائبہ تھا۔ بچپن سے میں نے جو کچھ سنا تھا اس نے میرے یقین کو اور پختہ کر دیا تھا کہ فرنگی کوئی دوسری مخلوق ہیں۔ میں اکثر سوچتی کہ یہ کھاتے کیا ہیں۔

والٹر نے سر اٹھایا اور میں نے جلدی سے نظریں ہٹالیں۔ دانہ چگتی ایک مرغی کی دم نظر آ رہی تھی اور چولھے کی روشنی سے فاتنہ کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔

میرے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک پڑوسن اندر آجاتی ہے۔ ''میرا خیال

تھا تم ابھی تک کام کر رہی ہو گی ؟ عام طور پر تو تم اتنی دیر تک نہیں جا گتیں''۔

'' میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ ہم رات کو نو بجے بجلی کا میٹر بند کر دیتے ہیں''۔ ذرا ان عورتوں کے بہانے دیکھو۔ کیسے کیسے گھڑتی ہیں۔ میں نے اون تقریباً سلجھا لیا تھا۔ میرا ذہن عجب زقندیں لگا رہا تھا۔ اون سے وہ تبدیلی نہیں آتی جس کی مجھے توقع تھی۔ یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب میں اپنی سوچ پر لگا میں اچھی طرح کس لوں۔ مگر اب میری نیند اڑ گئی ہے۔

بجلی بند ہو جاتی ہے۔ گھر میں اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ میری پڑوسن اپنے کمرے تک موم بتی کی روشنی میں واپس جاتی ہے۔ مجھے اپنا آپ تھکن سے چور لگتا ہے جیسے میں جیل کے سفر سے ابھی واپس لوٹی ہوں۔ جب بھی ایسی ہی تھکن تھی جیسی آج ہے۔ وہ عورت جب مجھے یہ بتانے آئی کہ میرے شوہر کو انہوں نے غوبیلہ بھیج دیا ہے۔ دل کیسا ٹھہر سا گیا تھا۔

گرینڈ وال کے اعزاز میں ہونے والے مظاہرے میں میں بھی تھی۔ سب اس کو یہی کہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریذیڈنٹ جنرل تھا۔ جس کے متعلق یہ افواہ تھی کہ بن یوسف کی واپسی اور بن عرفہ کو برخاست کرنے کے حق میں تھا۔ اپنی سفید گاڑی میں جاتے ہوئے وہ ایک لمبے قد کا آدمی لگتا تھا۔ وہ سفید کوٹ پہنے تھا اور تیل لگے کالے سیدھے بالوں میں پچھلی طرف کنگھی کی ہوئی تھی۔ ہجوم اس گاڑی کو اس طرح گھیرے ہوئے تھا جیسے بارات کا جلوس ہو۔

اگلی صبح میں اور رقیہ جیل جاتی ہیں۔ میں سادہ اور میٹھی روٹی ساتھ لے جاتی ہوں وہ اسے کاٹ کر دیکھتے ہیں۔ ٹوکری میں میرے شوہر کے نام کا کاغذ اڑس کر دوسری ٹوکریوں کے ساتھ ایک بڑے سے تختہ پر رکھ دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی انہیں اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ہم جیل کے دروازے سے اندر جاتے ہیں۔ وہ ہمارا نام ایک بلیک بورڈ پر لکھ دیتے ہیں اور دونوں کے نام کے ساتھ ایک ایک نمبر بھی۔ آخر میں کل میزان لکھنے کے بعد وہ ہمیں ایک ہال میں لے جاتے ہیں۔ ہال کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کے درمیان پہریدار کھڑے ہیں۔ ہال کیا ہے ایک چھتہ ہے جس میں آوازیں بھنبھنا رہی ہیں۔ میں نے دوسری طرف اپنے شوہر کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ مجھے ملا تو میں نے

حال احوال پوچھا۔مگر شور شرابے میں میرا سوال ڈوب گیا۔ میں نے اپنی نقاب گرالی اور بات سننے کی کوشش میں پارٹیشن سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔

''آزادی قریب ہے''۔اس نے کہا سیاست کی خبر اسے سمندر کی تہہ میں بھی مل جاتی اگر وہ وہاں جکڑا ہوا بھی پڑا ہوتا۔''ٹھیک بات ہے نا!''

''کچھ ایسا ہی لگتا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ جب اگلی بار ملنے آؤں تو اپنے ساتھ ایک چغہ اور نقاب بھی لیتی آؤں ۔اور پھر ہونے والے واقعات کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے عویدزم اور ریف کے واقعات بتائے ۔ یہ بھی کہ بائیں بازو کے فرانسیسی ہماری طرفداری کر رہے ہیں۔

''اور کچھ نئی تازہ''۔

''بن یوسف فرانس پہنچنے والا ہے۔''

اس کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے دھپ سے پارٹیشن پر ہاتھ مارا۔ جالی کے پردے پر سنتری نے اپنی چابیاں رگڑیں۔''سیاست کی باتیں کرنا منع ہے''۔

اگلی دفعہ میں جب ملنے گئی تو قطار میں کھڑی تھی ۔ اتنے میں ایک عورت جیل کے دروازے کے پاس پہنچی ۔اس نے کھانے پینے کی چیزوں کی ٹوکری نیچے رکھ دی۔سنتری نے کہا کہ وہ ٹوکری وہاں سے ہٹالے۔عورت نے سنتری کی بات پر عمل کرنے میں جب جلدی نہ کی تو سنتری نے ٹوکری کو زور سے ٹھوکر ماری سارے راستے میں سنگترے بکھر گئے ۔عورت نے اپنے برتن بھانڈے سمیٹے اور سارا وقت فرانسیسی کو کوستی رہی۔انہوں نے پکارا اور ہم سب دروازے کے گرد جمع ہوگئے ۔ جب تک کہ وہ گنتی کرتے رہے۔ یہ پہلی بار تھی کہ سنتری کچھ کم نظر آرہے تھے ۔صرف ایک نے ہماری گنتی کی اور بلیک بورڈ پر ہمارا نمبر لکھا وہ جب دفتر میں چلا گیا تو میں نے دیکھا ایک آدمی نے میزان مٹادی۔اور ایک نمبر بڑھا کر پھر سے لکھا۔

ہال میں پارٹیشن کے دروازے کھلے تھے۔قیدی اپنے ملاقاتیوں سے پہلی بار بے تکلف مل رہے تھے۔لگتا تھا کنٹرول میں کچھ نرمی آگئی ہے۔ میرا شوہر مسکرا رہا تھا۔اسے سیاست کی خبریں جاننے کے بے تابی تھی۔

''بات چیت مکمل ہوگئی ہے اور بن یوسف پہنچنے والا ہے''۔میں نے اسے بتایا ''وہ اٹھارہ کو پہنچ رہا ہے''۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔''جبہ اور نقاب کہاں ہے؟''

اپنے جلابے کے نیچے میں نے لہنگے کی پیٹ میں اڑسا دامن کھینچا۔اس نے جھک کر اٹھایا۔!

''ہمیں ایک قیدی کی فکر ہے''۔اس نے چپکے سے کہا'' شاید وہ اسے مار ڈالیں''۔

''تم اسے یہاں سے بھگاؤ گے؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ ہجوم سے گزر کر کہیں غائب ہوگیا اور جیل کی وردی لے کر واپس آیا۔جبکہ اس نے جلدی جلدی میرا جلابہ درست کیا۔میں نے وہ وردی اپنے پاس رکھی۔رباط بھی ساتھ لے کر گئی۔اس روز بدھ کو بھی وہ میرے پاس تھی جب اپنے آبائی شہر آنے کو میں نے وہ شہر چھوڑا۔

رقیہ مجھے اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے پر ملی۔اس کے ساتھ وہ عورت بھی تھی جس نے فقیہ کو اپنے گھر میں چھپایا۔اس عورت کا تعارف اس نے فقیہ کہہ کر کروایا۔ہم آزادی کے قریب تھے۔وہ میٹنگوں میں شرکت کرتی۔چندے جمع کرتی اور ناخواندگی کے خلاف جہاد کرتی۔اسی طرح مصروف رہتی۔میں نے اسے گلے لگایا۔دروازہ کھولا اور ان دونوں کے ساتھ اندر چلی گئی۔ہم جلابہ اتارے بغیر باتیں کرتے رہے۔

''یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس محلّہ میں عورتوں کے جلسے ہوں گے''۔رقیہ نے کہا۔

''ہم تینوں کو بومنظوف میں ایک جلسہ کا انتظام سونپا گیا ہے''۔صفیہ نے اضافہ کیا۔

ہم نے طے کیا کہ دو دن بعد ہم رقیہ کے گھر پہلی میٹنگ کریں گے۔ہم میں سے ہر ایک پانچ یا زیادہ عورتوں سے رابطہ کرے گا۔وہ آگے اتنی ہی عورتوں کو خبر کریں گے اور اس طرح ہم ایک گروپ بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

ہمارا منصوبہ کام کر گیا۔طے شدہ وقت پر گھر عورتوں سے بھر گیا۔صحن میں رقیہ، صفیہ اور میں نے ان سے خطاب کیا۔ہم نے انہیں بتایا کہ ہمارا ملک کیسے نازک دور سے

گزر رہا ہے۔انہیں نئے مراکش کی خوش خبری دی اور یہ بھی بتایا کہ معاشی آزادی اور ترقی کے لئے ہم کس طرح جدو جہد کر رہے ہیں۔سلطان نے اسے بعد میں عظیم جہاد کا نام دیا تھا۔ہم نے قومی تحریک کے اس فیصلے کی اہمیت پر زور دیا کہ ہرایک شہری جو کچھ زیادہ سے زیادہ دے سکتا ہو وہ ضرور دے۔عورتوں کے سوال ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ہم تینوں ششدر رہ گئیں کہ یہ عورتیں اہم معاملات پر ہم سے زیادہ باخبر تھیں۔

رقیہ چندے کے مصرف کے بارے میں ایک سوال کا جواب دے رہی تھی کہ دروازے کی طرف دیکھتے ہی فقرہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہوگئی۔ہم سب نے گھوم کر دیکھا وہاں فقیہ کھڑا ہنس رہا تھا۔ایک گھڑی کی خاموشی کے بعد جس میں ہم سب حیرت سے دم بخود رہ گئے تھے،ایک عورت نے مارے خوشی کے چیخنا شروع کر دیا۔دوسری اس کے ساتھ ملی اور پھر تیسری اور دم بھر میں سارا گھر مارے خوشی کے پھولا نہیں سم رہا تھا۔عورتوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔اس کے ہاتھ چومے جیسے وہ حج کر کے آیا ہو۔

ایک ایک کر کے عورتیں رخصت ہوئیں۔صرف فقیہ اور ہم تینوں رہ گئے۔وہ بیٹھ گیا ہم اس کے گرد بیٹھ گئیں۔اس نے میٹنگ کا نتیجہ پوچھا۔

''ہم تعلیمی مرکزوں میں داخلہ کر رہے ہیں''۔میں نے کہا''یہ سب سے مقدم ہے''۔

''ہم 18 نومبر کی تقریبات کا انتظام کر رہے ہیں''صفیہ نے بتایا۔

''وطن پرستوں کے لئے عطیات جمع کر رہے ہیں''۔میں بولی۔

''میں خزانچی ہوں''۔رقیہ نے کہا۔اس کا فخر ڈھکا چھپا نہ تھا۔

فقیہ کا چہر بدل گیا تیوری چڑھ آئی۔ذرا ٹھہر کے اس نے کچھ کہا۔جس کا خلاصہ کچھ دنوں بعد میرے شوہر نے دہرایا۔ہماری خوشیوں پر پانی پھر گیا۔''میں یہ سب کچھ کڑی شرط پر مانتا ہوں۔روپیہ پیسہ میرے گھر میں نہیں آئے گا''۔

کیا اعتماد اور دن ختم ہونے کو تھے؟ کیا یہ واقعی ختم ہو سکتے تھے،تیاریاں تو ہو ہی رہی تھیں جو تبدیلی کا پتہ دیتی تھیں اور عمل دبے پاؤں پیروی کرنے کو تھا۔یہ درست ہے کہ اصول انسان کا سب سے نازک سرمایہ ہیں۔شیخ کی بات کتنی سچی تھی۔

رقیہ نے فقیہ کی شرط کا جواب اسی طرح دیا۔''مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ہم

رسید دیں گے۔سوائے پچاس فرانک کے''۔

وہ چندے کی چیزوں کے اپنے گھر میں آنے پر کسی طرح راضی نہ تھا۔میری دلیل یہ تھی کہ میرا گھر چھوٹا ہے۔آخر صفیہ نے اپنا گھر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑی مشکل ٹلی جو ہمارے سارے منصوبے کو خاک ملا دیتی۔

شام ہوتے ہم پہلے دن کے عطیات لے کر پہنچیں ۔ہم بیٹھی انتظار کرتی رہیں رقیہ بغل میں ایک بیگ دبائے بیٹھی رہی اس وقت تک جب تک تحریک آزادی کا نمائندہ آن پہنچا۔جیسے ہی وہ اپنی نشست پر بیٹھا رقیہ نے اپنا بیگ کھولا اور ایک رومال پر الٹا کر خالی کر دیا۔ہم نے رقم گنی اور آدمی کے حوالے کی ۔اس کی موجودگی میں ہی چیزیں الگ الگ کیں ۔پیتل اور تانبے کا گھریلو سامان، زیور، کپڑے اور ان میں سے کچھ واقعی قیمتی اور نفیس۔

ہم چیزیں الگ الگ کر چکے تو رقیہ نے یاد دلایا کہ ہمارے تعلیمی مرکز کا وقت ہو گیا ہے۔ہم نے اپنے اپنے قلم اور نوٹ بک سنبھالی اور چل دیں۔گلی میں گھستے ہوئے میں نے کہا'' آخری بات ہمیشہ مغرب کے وقت آتی ہے''۔

''تمہاری مثالیں بھی معمہ ہیں'' رقیہ نے کہا۔

میں نے وضاحت کی'' ایک عورت میری نانی کے گھر کے پاس رہتی تھی ۔اس کا ایک بیٹا تھا وہ کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کیئے رکھتا۔وہ سارا دن سڑک پر گزارتا اور مغرب کی نماز کے بعد گھر کو لوٹتا۔سارا دن لوگ نانی کے پاس شکایتیں لے کر آتے۔آخری شکایت سنتے ہی مغرب کی اذان ہو جاتی اور کہتی'' آخری بات ہمیشہ مغرب کے وقت آتی ہے''۔ ہمارے شہر میں یہ جملہ ضرب المثل ہو گیا۔معنی یہ تھے کہ ڈھیروں فکریں اور پریشانیاں''۔

رقیہ ہنسی'' سو مغرب کے وقت ہم جہالت سے لڑتے ہیں''۔

''یہ سب باتیں مجھے ڈراتی ہیں''۔صفیہ نے کہا'' مجھے لگتا ہے جیسے ان ہی دنوں ہم اپنی پوری زندگی جی رہے ہیں''۔

''ہم آزادی کے موقع پر جی رہے ہیں''۔میں نے جواب دیا۔'' کچھ اندازہ ہے تمہیں، کسی بھی شخص کے لئے ایسے وقت میں جینے کے کیا معنی ہیں؟''

صفیہ میری پوری بات سنے بغیر بولتی گئی ''اس کے باوجود مجھے ایسا لگتا ہے میری روح کھلی جا رہی ہے''۔

''مجھے بھی'' رقیہ اور میں ایک ساتھ بول اٹھیں۔ ہمیں اپنے حال پر ہنسی آ گئی، اس ہنسی نے ہمیں تازہ دم کر دیا۔

وہی دن تھے جب ہمیں قیدیوں کے چھٹنے کی خبر ملی۔ جیل کے دروازے پر ایک پوری قوم سفید لباس پہنے کھڑی تھی۔ لوگ خوش دلی سے ہنس رہے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے زور زور سے بول رہے تھے۔ ہر کوئی اللہ کی قدرت کا قائل تھا کہ کس طرح دن پلٹ جاتے ہیں۔ اللہ کے جلال کا احساس اور شدید ہوا جب جیل سے ایک ایک کر کے قیدی باہر آنا شروع ہوئے۔ شادی کا سا سماں، اس سے بھی زیادہ خوش ہونے کا موقع۔

18 نومبر کی تقریبات بھی اس کے فوراً بعد شروع ہو گئیں۔ اس دن کو کوئی کیونکر بیان کرے؟ سارا کیسا بلانکا ایک بڑی سی تقریب بن گیا۔ ہر طرف اسٹیج اور لاؤڈ سپیکر، گانے، رقص، تقریریں ہوا میں تھڑوں پر بنتی، چائے کی خوشبو۔

اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کی چھت سے ہم ساری رات جشن کا تماشا دیکھتے رہے۔ سارا شہر روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ چاروں طرف ایک شور ایک ہنگامہ کا نشہ سا تھا۔

ابھی ہم سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ کسی نے بتایا کہ ہم رباط جا رہے ہیں۔ ہم ایک بس پر سوار ہوئے۔ سارے راستے رقیہ انجن کے ہڈ پر بیٹھی نعرے لگاتی جھنڈا ہلاتی رہی۔ بہت بعد میں جب میں نے اسے یہ بات یاد دلائی تو وہ مسکرا کر بولی ''ان دنوں ہم دیوانے تھے''۔

ہم سب اکٹھے ایک ہجوم بن کر رباط گئے۔ پہیوں والی چیز پر سوار تھے۔ سفر میں گھنٹوں لگ گئے۔ کتنے؟ مجھے اندازہ نہیں۔ ہم اتنی ہمت اور امنگ کہاں سے آ گئی تھی۔ سفر کیسے کٹا؟ محل کے گراؤنڈ میں ہم سب سمائے کیسے؟ پھر مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جلد از جلد پہنچنے کو میرا جی چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب، ہیجان مجھے بڑھائے لئے جاتا تھا۔ میں سلطان کو پہچانتی تھی۔ گو صرف ایک بار دیکھا تھا مگر مجھے ان کا چہرہ یاد تھا۔ جب فرانس سے واپسی پر کیسا بلانکا آئے تھے تو میں نے انہیں دیکھا تھا۔ جہاں قبائلی گھڑ سواروں نے ان کی پیشوائی کی تھی۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل تھی۔ جو ان کے جلوس کے

راستے میں پذیرائی کو کھڑا تھا۔ میں نے ہاتھ بھی ہلایا تھا۔ایک جھلک اس چہرے کی میں نے دیکھی تھی اور وہ نقش اپنے حافظہ میں محفوظ کر لئے تھے۔اپنائیت اور محبت کا ایک گہرا احساس میرے اندر ابھرا تھا جیسے کسی مانوس چہرے کو ایک مدت بعد دیکھا ہو۔

جب انہیں جلا وطن کیا تھا تو پوری قوم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس سوگ میں شریک تھی۔اس کے بعد کیسا بلا نکا پر بھوتوں کا راج ہو گیا۔ہمیں سلطان کی شکل چاند میں نظر آنے لگی۔

جیسا کہ کہا جاتا تھا کہ جلا وطنی میں فرانس کی تقدیر مراکش کے ہاتھوں میں تھی۔معاملہ اس کے برعکس نہ تھا۔

آزادی کے موقعہ پر سلطان اپنے بیٹوں کے درمیان بالکنی میں آئے اور محور دربار میں موجودلوگوں نے تالیاں بجائیں،نعرے لگائے ہنسے روئے۔

کمال ہے ہمارے دلوں پر ان کا کیسا راج تھا۔جلا وطنی نے انہیں مقدس بھی بنا دیا تھا۔ان کی خاطر لوگوں نے آزادی کی جدو جہد کی جو کٹھن سہی۔جیسے وہ ایک آئیڈیل، ایک اصول ہوں،فرانسیسیوں نے اگر انہیں جلاوطن نہ کیا ہوتا تو مراکش میں ان کی حکومت طویل ہوتی۔مجھے اس بات کا یقین ہے۔بادشاہ کی جانب سے ولی عہد نے مختصر سا خطاب کیا اور لوگوں کی خوشی کا اظہار دیوانگی سے کم نہ تھا۔

اگلے دن، میں نے محور میں جو دیکھا وہ اس سے لگا نہیں کھاتا جو ان کی وطن کی واپسی والے دن ہوا تھا۔

18 نومبر کی تاج پوشی والی تقریر میں نے کتنی بار سنی تھی! کیا تقریر تھی! مجھے حفظ ہو گئی تھی اور میں آج تک اسے دہرا سکتی ہوں۔میں جب بھی ان کے لفظ دہراتی ہوں،نیکی کا ایک گہرا احساس میرے اندر تیر جاتا ہے۔ان لفظوں کے ساتھ سلطان کی آواز کا اتار چڑھاؤ بھی۔جس طرح وہ حروف معرفہ ادا کرتے تھے۔لوگ سڑکوں پر وہ تقریر دہراتے پھرا کرتے۔چھوٹے چھوٹے بچے بھی۔

آج کے دن رب کریم نے دوہری خوشیاں ہمیں عطا کی ہیں۔ایک تو لمبے ہجر کے بعد اپنے پیارے وطن کو واپسی کی نعمت اور دوسرے ان لوگوں کے درمیان پھر سے

موجود ہونا جو ہمیں بے حد عزیز ہیں اور جن کی جدائی ہم پر شاق تھی ۔ ہم نے کبھی بھولے سے بھی انہیں فراموش نہیں کیا اور ہمارے لوگ بھی ہمارے جاں نثار رہے ۔

جیسے ہی سلطان اس دیدار کے بعد ہاتھ ہلا کر پلٹے دربار کے ایک طرف سے چیخنے چلانے کی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں ۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن لوگوں سے معلوم ہوا کہ ایک سازشی کو پکڑ کر لوگوں نے مار دیا۔ انہیں اس کی نیت پر شبہ تھا۔ کون اسے لے کر آیا تھا وہاں؟ شاید اس کی موت ۔

ایک اور سازشی کی موت کا واقعہ یاد آ گیا۔ جس کی میں چشم دید گواہ تھی ۔ اس خیال کے ساتھ دل رنجور بھی تھا۔ موت کے خیال سے رنج ہونا فطری ہے ۔ سارا واقعہ آنکھ کے سامنے اس طرح زندہ ہو گیا جیسے وہ واقعہ ابھی ابھی ہوا ہو۔ میں نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کا ایک آدمی چغہ اور پگڑی پہنے اپنے قاتل کی طرف مڑا۔ اس کا حلیہ بھی مجھے خوب یاد ہے ۔ لمبا قد ، بڑی ناک اور تیونسی انداز کی ٹوپی ۔ اس نے چغہ پہنا ہوا تھا اور ادھیڑ عمر کے شخص سے ذرا پرے کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی بندوق تانی ہوئی تھی ۔ اس کا سیاہ رنگ آج بھی تصور میں تازہ ہے ۔ چند لمحوں میں سب کچھ ہو گیا۔ دونوں آخری وقت تک ایک دوسرے کو کھڑے گھورتے رہے ۔ بندوق والے آدمی کی آنکھوں میں ارادے کی چمک اور مقتول کی آنکھوں میں زخمی شکار کا سا کرب ۔ گولی چلی ، مرنے والے کا چہرہ خوف سے بھیانک ہو گیا دوسری گولی چلنے سے پہلے ایک ان جانی حیوانی سی آواز اس کے حلق سے نکلی ۔ میں نے اسے گرتے نہیں دیکھا۔ اس کا گرنا مجھے یاد نہیں ۔ بندوق والا آدمی خاموشی سے چلا گیا اور قلعہ کی ہوئی دیواروں کے درمیان ایک تپلی گرد آلود گلی میں غائب ہو گیا۔

سلطان کے دربار عام کے بعد انہوں نے میرے شوہر کو رباط میں وہ منحوس عہدہ دیا۔ وہاں جانے سے پہلے ہمیں صفیہ کے گھر میں جمع عطیات میں آئی ہوئی ساری چیزیں بیچنا پڑیں ۔ یہ واقعہ میں کبھی نہیں بھلا سکتی ۔ اپنی ایک حرکت سے اس نے جدو جہد کی نیک نیتی ، بھروسہ اور خوش عقیدگی کو خاک میں ملا ڈالا ۔

وہ سارا دن ہم نے کپڑوں اور گھریلو سامان کے انبار کے درمیان گزارا۔ ہمارے ساتھ ایک تحریک آزادی کا رکن اور کچھ لنڈے بازار کے دوکاندار تھے ۔

جیسے ہی نیلام ختم ہوا ہم نے کارکن کو رقم پکڑائی اور رخصت ہو لئے ۔ سڑک پر

آتے ہی ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ میں اس طرح ٹھٹک گئی جیسے مجھے سانپ نظر آ گیا ہو۔ ریشم کا وہ لباس جو مجھے اور صفیہ کو عطیات جمع کرنے کی مہم کے ایک چکر میں ملا تھا۔ اس سامان میں نہیں تھا۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی کو دفن کر کے آئی ہو''۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ میں نے اسے اندازہ لگانے کی زیادہ مہلت نہ دی۔ صفیہ نے عطیات میں سے کچھ اپنے لئے رکھ لیا تھا۔ میں نے صاف صاف بتا دیا۔ جس طرح اس فقیہ نے کہا اس نے بھی وہی گمبھیر سوال پوچھا ''ابھی سے شروع کر دیا انہوں نے؟''

میرے لئے صفیہ اسی دن مرگئی۔ وہ صفیہ جسے میں جانتی تھی۔ تو ان ہزاروں میں سے ایک ہے جو ہوا کے رخ پر کہیں سے آ گئے تھے۔

لوگ کس طرح چھپے رہتے ہیں۔ ہمیں یہ پکا خیال ہوتا ہے کہ ہم انہیں جانتے ہیں لیکن ہم انہیں کہاں جانتے ہیں۔ صفیہ کے بعد میرے شوہر کی باری تھی۔ میرے دل سے اس کا بھروسہ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ شبہ اور بے اعتباری میرے دل میں بس گئی۔

میں صفیہ کے بارے میں شیخ کو بتاتی ہوں اور یہ بھی کہ اس نے کچھوے کی طرح اپنا خول بدل ڈالا۔ ان کا جواب میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ''جب کچھوا اپنے خول سے باہر آ جاتا ہے تو وہ کچھوا نہیں رہتا کچھ اور ہو جاتا ہے''۔

کمروں میں سے کسی ایک میں کلاک بجتا ہے۔ میں اس کی گھنٹیاں گنتی ہوں۔ کیا فجر کا وقت ہو گیا؟ جاگ جاگ کر میں جلد ہی پاگل ہو جاؤں گی۔ نماز میں مجھے یہ سکون ملتا ہے کہ اللہ کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ نماز میری بے خوابی کا علاج بن جاتی ہے۔ نیند جس گھڑی اڑ جاتی ہے میں اٹھ کر نماز پڑھنے لگتی ہوں۔ اس وقت تک جب صبح دم مجھے نیند آ جائے۔ کیا اچھی بات پتہ چلی!

پانچواں باب

اون کات کر بیچنے کے بعد مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے چند فرانک ہی کمائے ہیں۔ میرا دل بجھ جاتا ہے۔ مایوسی کے عالم میں میں پھر درگاہ کی طرف چل دیتی ہوں۔

گلیوں میں چوڑے چکلے مرد، خستہ دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔ انہیں کس چیز کا انتظار ہے؟

درگاہ میں شیخ عورتوں اور مردوں کے لئے تعویز لکھے جا رہے ہیں۔

ایک سسکتا شہر امید اور معجزوں کی آس پر موت کو ٹال رہا ہے۔ میں شیخ کو سلام کرتی ہوں۔ ''اپنے چہرے سے تیوری مٹا ڈالو''۔ وہ خوش دلی سے کہتے ہیں۔

میں جان بوجھ کر ماتھے پر ہاتھ پھیرتی ہوں۔ ''اس کا فائدہ کچھ نہیں۔ یہ پھر واپس آ جائے گی''۔

وہ میری بات سننے کی خاطر قلم رکھ دیتے ہیں۔

''میں نے اون کات کر بیچا''۔ میں ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی ہوں۔

''لیکن اون کاتتے وقت کیا تمہارا دکھ کچھ کم نہیں ہوا؟''

''کافی عرصہ پہلے میں نے درد کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ ایک چرخہ سے پورا ماضی تو نہیں چھپایا جا سکتا۔ مجھے سکون نہیں ملتا''۔

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو''۔

''میں جا رہی ہوں''۔

’’کہیں اور جانے سے تم اپنے آپ سے نہیں بچ سکتیں‘‘۔

’’میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں ایسے ہی کروں گی۔ مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کیجئے۔اس شہر میں میں میرے لئے کیا رکھا ہے۔‘‘

’’لیکن یہ تمہارا وطن ہے‘‘۔

’’وہ شہر جس میں پیٹ بھر روٹی نہ ملے، میرا وطن نہیں ہے‘‘۔

’’کہاں جاؤ گی تم؟‘‘

’’کیسا بلانکا‘‘۔

وہاں کیا کرو گی؟تعلیم تمہاری کچھ ہے نہیں‘‘۔

میرا مذاق اڑانے کو جی چاہتا ہے۔ان کا نہیں اپنا۔’’میرے پاس تعلیم کی تحریک میں ملنے والا ڈپلومہ ہے۔آپ نہیں جانتے؟‘‘

وہ کچھ جواب نہیں دیتے۔

’’اوروں کی طرح مجھے بھی مستقبل کی زندگی کے لئے تیار ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا‘‘۔میں بولتی چلی جاتی ہوں۔میرے پاس کہنے کو کچھ خاص نہیں لیکن میں انہیں بولنے پر اکسانا چاہتی ہوں‘‘۔

وہ خاموش رہتے ہیں۔ میں پھر کچھ کہتی ہوں۔تبدیلی آئی،مگر شاید مٹھی بھر لوگوں کے لئے۔

’’اپنے غصے کو یہ اجازت نہ دو کہ وہ تمہارا دل خاک کر دے‘‘۔آخر کار وہ اپنے لہجے میں کہتے ہیں۔ان کے پاس ہر بات کا جواب ہے۔اب چونکہ میں نے انہیں الجھا لیا ہے وہ میرے اگلے حملے کے لئے تیار ہیں۔

’’نصیحت کرنا تو بہت آسان ہے۔آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔میری جگہ ہوں تو پتہ چلے۔وہ ہوانا سگار پیتے ہیں۔کانٹے چھری سے کھاتے ہیں اور چلچلاتی گرمی میں فر پہنتے ہیں۔

’’ایمان والوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے رب کو نہیں بھولے‘‘۔وہ مجھے ٹوکتے ہیں۔آہستگی سے آیتیں پڑھتے ہیں۔’’کچھ مر گئے اور کچھ کو اپنے انجام کا انتظار ہے۔وہ کسی تبدیلی سے نہیں گھبراتے‘‘۔

میرے غصے کو قابو کرنا ان سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ وہی دل پلٹتے ہیں جو ایمان سے بے خبر ہیں۔

آج کل میرے شوہر کو ایسی بیوی کی تلاش ہے جو مہمانوں کو سگریٹ پیش کر سکے اور اس کی ترقی کی راہیں آسان کرے چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔
ایک دن اس نے مجھے دھوپ میں نوکروں کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ اگر بندوق ہاتھ میں ہوتی تو گولی مار دیتا۔
میری سمجھ میں کچھ نہ آیا میں اس کے پیچھے اوپر چلی گئی۔ پھر نیچے اتری ایک صوفے کے کنارے پر یوں ٹک کر بیٹھی جیسے اپنے نہیں کسی غیر کے گھر میں ہوں۔ وہ میرے پاس سے ہو کر گزر گیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے کھانے کے کمرے میں گئی۔
ہم دونوں کھانا کھانے بیٹھے۔ ہمارے درمیان میز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس کی ملازمت کی امیدوار ہوں۔ تب تک ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے تھے۔ ہمارے درمیان دیوار سی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میرے لئے اس کی شکل اب اجنبی تھی۔ میرے لئے نامانوس۔ جتنا میں نے اسے دیکھا، فاصلہ اتنا ہی بڑھتا گیا۔ وہ کانٹے سے کھا رہا تھا اور میں ہاتھ سے۔ پلیٹ سے کانٹا ٹکرانے کی آواز رک گئی تو میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا وہ مجھے اس طرح گھور رہا تھا جیسے مار ڈالے گا۔ میں کھڑی ہونے لگی تو کرسی الٹ گئی اور وہ دھڑ سے فرش پر جا گری۔
''تمہیں میرا ہاتھ سے کھانا پسند نہیں؟ میرا نوکروں کے ساتھ بیٹھنا تمہیں اچھا نہیں لگتا؟ ان کی خاطر ہم نے سامراجیوں سے جنگ لڑی اور اب تم نے سامراجیوں کی طرح کرنا شروع کر دیا''۔
میں میز سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اوپر چلی گئی۔ میں نے کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی سڑک پر نکلتے نکلتے انجن کی چیخیں نکل گئیں۔ حالات ایسے موڑ پر پہنچ گئے تھے کہ ان کو میں کسی طرح درست نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ حالات بدلنے کا لطف نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ اسے ایک نئی عورت چاہئے تھی۔ ہر لحاظ سے نئی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی تیاری میں تھا۔ میرے سارے اندازے وہم سے زیادہ نہ تھے اس دن تک جس

دن مجھے حمام سے لانے کو ڈرائیور نہ پہنچا۔ بعد میں اس نے بڑی معذرت کی کہ وہ میرے شوہر کی سیکرٹری کو ہوٹل پہنچانے چلا گیا تھا۔

''ہوٹل؟'' میں نے پوچھا۔ صحیح بات کا علم ہو جانے پر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

''جی ہاں، ٹائپ رائٹر کے ساتھ۔ وہ وہیں کام کیا کرتے ہیں''۔

یہ شخص خود احمق ہے یا مجھے احمق بنا رہا ہے۔ ''کوئی بات نہیں۔ تمہارا اس میں کیا قصور۔ لگتا ہے اب سیکرٹریوں کے دن پھر گئے ہیں''۔

میں نے اپنے دل میں ایک ایسی دلدوز تقریر تیار کی جو اسے خون کے آنسو رلا دیتی۔ مگر وہ اس رات گھر ہی نہیں آیا۔ صبح دم جب میں نے اس کی گاڑی کی آواز سنی تو زن سے نیچے گئی کہ اس کا سامنا کروں وہ اندر آیا اور سیڑھیوں پر لڑکھڑایا۔ میں تیزی سے لپکی۔

''کہاں تھے تم؟''

''کام کر رہا تھا''۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا رہا۔

''کام کر رہے تھے؟ ہوٹل میں سیکرٹریوں کے ساتھ؟'' وہ رکا اور اس بات پر حیران کہ میں بے خبر نہ تھی۔ ''وہ ہوٹل ہیں کہ قحبہ خانے؟ بل کہاں سے ادا کرتے ہو؟ یا انہیں خزانے کے محکمہ کو بھیج دیتے ہو''۔

سونے کے کمرے کے دروازے پر وہ پلٹا اور میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ ایک ہاتھ سے چہرہ تھامے اور دوسرے سے اس کی طرف اشارہ کر کے اپنی پوری قوت سے میں چیخ کر بولی۔ جیسے کسی خیالی ہجوم سے خطاب کر رہی ہوں۔ ''اور ہمیں تم جیسوں سے اصلاح کی امید ہے۔ تم لوگ سامراجیوں سے زیادہ خطرناک ہو''۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب رقیہ اور رفقیہ رباط آئے ہوئے تھے۔ ان کے آنے کے اگلے دن میری آنکھ کھلی تو میں تھکن سے خستہ حال تھی۔ مجھے ان دونوں کا خیال آیا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ رات بھی اس نے کہیں اور گزاری تھی۔ تھوڑی دیر لیٹی کروٹیں لیتی رہی۔ پھر ہمت کر کے اٹھی اور کسی طرح گھسٹ گھسٹ کر غسل خانے تک پہنچی۔ مشینی طریقے سے آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے سر سے رومال، گرہ کھولے بغیر کھینچ کر اتارا۔ بکھرے بال سمیٹے۔ آئینہ میں جو چہرہ تھا اسے میں نہیں پہچانتی تھی۔ اس چہرے پر وہ سارا رنج ظاہر تھا، جو میرے اندر لہریں مارتا تھا۔ گالوں کی ابھری ہڈیوں کے

پیچھے میری آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ وہ نقش جو کبھی نازک تھے اب کمزور اور بیمار لگنے لگے۔

میں رقیہ کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھی۔

''نیا گھر مبارک ہو''۔اس نے کہا۔

''سرکاری گھر''میں نے لاتعلقی سے کہا۔

''کیا مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟ تم جانتی ہو محمد نے اسے کوڑیوں کے مول خریدا ہے''۔میں نے سامنے رکھے رزق کی قسم کھائی کہ میرے فرشتوں کو خبر نہیں کہ سرکاری املاک کسی بھی قیمت پر خریدی جا سکتی ہیں کجا کہ کوڑیوں کے مول جیسا کہ وہ کہہ رہی ہے۔اس وقت مجھے اس بات کا بھی خیال نہ تھا کہ ایک میں ہی تھی جسے سب سے آخر میں یہ اطلاع ملی۔اس نے مجھے ایک گلاس دیا۔میں نے گلاس لے لیا اور پھر رکھ دیا۔

''چہرے سے لگتا ہے جیسے تم سوئی نہیں''۔اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے جیسے کچھ ہونے کو ہے''۔میں نے بہت دکھ سے اس کے سامنے اعتراف کیا۔

''سب وہم ہے تمہارا''میری بات ٹالنے کو اس نے کہا۔

''تم خود نہیں دیکھ رہیں۔وہ راتوں کو بھی گھر نہیں آتا''۔

وہ ان جان بنی رہی۔''تم نہیں جانتیں اس کی ذمہ داریاں کتنی ہیں؟''

''اپنی بات کے سچ ہونے کا ثبوت میرے پاس ہے۔کل رات میں نے ایک اور خواب دیکھا''۔

اسے اب خطرے کا احساس ہوا۔اس کا چہرہ ایک دم پریشان لگنے لگا۔''خدا کرے سب ٹھیک ہو۔خیریت رہے۔انشاءاللہ''۔

میں نے دیکھا کہ میں سیڑھی کے اوپر چڑھی ہوئی ہوں۔اور اپنے بیڈروم میں جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔فرش کہیں بہت نیچے رہ گیا ہے اور سیڑھی کمرے تک نہیں پہنچ رہی۔میں دونوں کے بیچ لٹکی ہوئی ہوں۔میں نے ایک جوان عورت کو کمرے میں جاتے دیکھا۔وہ مجھے دیکھ کر سانپ کی طرح زہریلی مسکراہٹ سے مسکرائی۔میں نے بےچارگی کے عالم میں ہوا میں معلق تھی۔میں اسے کس طرح روک سکتی تھی''۔

''پھر کیا ہوا؟''

''جیسے گھوڑے سم اٹھا کر پیچھے ہٹتے ، سیڑھی دوسری طرف ٹھاہ کر کے دیوار سے جاٹکرائی''۔

''کیا تم نیچے گر پڑی تھیں؟''اس نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

''اس سے پہلے کہ کچھ ہوتا میری آنکھ کھل گئی''۔

ہم دونوں چپ بیٹھی رہیں ہمارے اندر ڈر بڑھتا گیا۔

''شیطان بہکا رہا ہے تمہیں''۔اس نے کہا۔

میں نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔''ہم اپنے خوابوں کی تعبیر اپنی منشاء کے مطابق کرتے ہیں اور صحیح معنی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔رقیہ یہ خواب میری سمجھ آتا ہے۔بات بالکل صاف ہے''۔

خوف سانہیں جارہا تھا۔خواب کے بارے میں رقیہ نے پھر سوچا اور بولی''چلو کسی فال نکالنے والی کے پاس چلیں۔وہ ہمیں صحیح تعبیر بتا سکے گی۔''

. . . . میرا گھر، سرکار کا گھر۔جب میں پہلی دفعہ یہاں آئی تو لگا جیسے خواب دیکھ رہی ہوں۔مجھے خوب یاد ہے۔اس طرح کی سنسنی جو غریب کے کھلے میدانوں میں راحل اور فقیہ کے ساتھ چلتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔جیسے کچھ بھی سچ نہ ہو۔اسے دوبارہ میں نے اس وقت محسوس کیا تھا جب پہلی بار وہ مجھے نیا گھر دکھانے لے گیا تھا۔اس نے ایک بڑا سا دروازہ کھولا۔سامنے ایک لان تھا۔جس میں سلیقے سے ترشے ہوئے صنوبر کے درخت لگے تھے۔آخری سرے پر محل نما عمارت تھی۔میں سڑک پر چلنے لگی کہ مجھے ٹھوکر لگی۔میں نے نیچے دیکھا تو کنکریوں کے بیچ سے گھاس پھوٹ رہی تھی۔اس نے دروازہ کھولا اور میں اس کے ساتھ ساتھ اندر چلی گئی۔بڑا آراستہ ہال تھا جس کے بیچ میں ایک چوڑا سا زینہ تھا۔سفید سنگ مرمر کی سیڑھیاں، اس پر سرخ قالین، پیتل کے سہاروں سے اپنی جگہ جما ہوا۔

یہ منظر دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔میں نے اپنی نقاب اٹھائی اور اپنے اردگرد دیکھتی رہ گئی۔اس نے مجھے بازو سے کھینچا اسے سارا گھر دکھانے کی جلدی تھی۔ایک دروازہ اس نے دھکیل کر کھولا۔

''باورچی خانہ''۔

''یہ تو بالکل بس اسٹیشن جیسا ہے''۔

اس نے الماریاں کھولیں اور پٹ کھلے ہی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔
''حضرت سلیمان کا سا خزانہ''۔

ہم ایک دوسرے زینہ سے نیچے اترے۔ یہ پچھلا صحن تھا۔اس کے چاروں طرف دیوار حصار تھا اور اس کے بیچ سبز رنگ کا ایک دروازہ تھا۔ بائیں طرف کئی کمرے تھے۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ ''گیراج اور شاگرد پیشہ'' اس نے وضاحت کی۔

اس نے سبز دروازہ کھولا۔ہم ایک خوبصورت پائیں باغ میں تھے، جہاں سنگتروں اور لیموؤں کے پودے تھے۔ان کے گرداگرد سلاد گاجروں اور اسٹرابری کی کیاریاں تھیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب ایک عجیب سی سنسنی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا کہ کچھ بھی سچ نہیں ہے۔ زمین، نہ میرا شوہر، نہ گھر اور نہ ہی فرانسیسی حکومت کا خاتمہ۔

''میرے اللہ، کس بات نے انہیں یہ سب کچھ چھوڑ جانے پر مجبور کیا؟'' گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے میں نے کہا۔

''ہم نے کیا، ہم نے دھکے مار کر نکالا انہیں!'' میرے شوہر نے ہذیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ میری ہنسی بھی اس میں شامل ہوگئی۔

سو اب پھر وہی تھا۔ وہی سب کچھ میرے ساتھ کرنے کے لئے آمادہ اور یہ میں تھی رقیہ اور ایک خادمہ کے ساتھ ساتھ رباط کے پرانے شہر کی گلیوں میں فال نکالنے والی سے ملنے کے لئے! کیا میں بھی اسی خرافت پر یقین رکھتی ہوں جس نے میری ماں کو گور کنارے پہنچا دیا تھا۔

ابھی میں شہر ہی میں تھی جب میرے ابا بیمار پڑے۔اگست کی حبس والی سہ پہروں میں میں ان سے ملنے جایا کرتی۔ خالی گلیوں میں میرے کپڑوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہ ہوتی۔ پتلی گلیوں میں چلتے ہوئے۔ دوکانوں کے سائبانوں کے نیچے سے پرانے پلستر سے جھانکتے نظر آتے۔ پرانے برتنوں میں تانبے کی ٹونٹیوں سے گرتے پانی کی آواز۔شہر کی بیکریوں کے تندوروں میں جلتے بلوط کے پتوں کی خوشبو۔بچپن سے مجھے یہ سب چیزیں عزیز تھیں۔ مسجد کے دروازے پر دیوانے کو دیکھ کر میری طبیعت بے

چین ہوتی۔ میں پل سے گزرتی اور میرا دل اس کے لئے خون ہوتا۔لوگ کہتے تھے جادو ٹونے نے اسے دیوانہ کر دیا۔ میں اپنے ابا کے گھر پہنچتی۔ بہتا فوارہ اور گھر کی خنکی میرا خیر مقدم کرتی۔ دیوانہ کو بھول کر میں شام کو آنے والے مہمانوں کے لئے تیاری کرتی کچھ دیر میں میرا شوہر آجاتا اور ہم مغرب کی اذان کے ساتھ واپس ہوتے۔ مجھے علم نہ تھا کہ میری اماں کیا منصوبے بناتی رہتی تھیں۔

وہ جادوٹونے والے کو میرے ابا کے پاس لاتیں وہ ان پر منتر پڑھتا۔اس نے میری اماں کو بہلا پھسلا لیا کہ سونے کے زیورات کو وہ دوگنا کر سکتا ہے۔ بے چاری عورت نے اپنے کڑے، آویزے اور اس کے ساتھ ساتھ میرا ہار اور پٹی بھی، جو میں نے ان کے پاس رکھوائے تھے اسے دیدی۔ سب چیزوں کی انہوں نے پوٹلی بنائی اور اندھیرے میں باہر چلی گئیں۔گلیاں کالی تھیں، دوکانیں بند، بس دریا کے پانی کا شور۔ یہ سب انہوں نے ہمیں بعد میں بتایا۔اس رات کے واقعہ نے انہیں تمام عمر کے لئے مفلوج کر دیا۔

انہوں نے بتایا کہ اس شخص کو انہوں نے مسجد کے سامنے دیکھا اور وہ اس کے پاس گئیں۔انہوں نے اپنی پوٹلی زمین پر رکھی اور مڑ کر دیکھے بغیر مسجد میں چلی گئیں جہاں اس کی ہدایت کے مطابق محراب کے نیچے سات رکعت نماز پڑھنا تھی۔ جب وہ باہر آئیں تو وہ شخص پوٹلی سمیت غائب تھا اور وہیں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔

اس دن سے ان جادوٹونے والوں کے لئے میرے دل میں نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ نفرت اس حکومت سے بھی تھی جو لوگوں کی املاک اور ذہنوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھ رہی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن یہ وقت مجھ پر بھی آئے گا۔

خادمہ نے دروازہ کھولا۔ میں اور رقیہ اندر چلی گئیں۔ہم اس کے ساتھ ایک اندھیرے سے کمرے میں گئیں جو عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا اور خوشبوؤں کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ دروازے کے پاس ہمارے لئے جگہ کی گئی۔ کسی کو کسی کا دھیان نہ تھا۔ ہر کوئی خوف سے سہا ہوا تھا۔ ہماری باری آئی اور عورت نے آہستگی سے اپنے کارڈ ترتیب دیئے اور کہنا شروع کیا۔

''بڑی گہری دھند ہے۔ بے وفائی کی بو آ رہی ہے۔لیکن ضرورت پڑنے پر ہم

مردوں کی طرح ہو سکتی ہیں۔ وہ تو ہمیں کتوں سے نچوانا چاہتے ہیں۔ دل چھوٹا مت کرو۔ اطمینان بھی دور نہیں۔ وہ جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ اپنے صبر کا پھل پاتے ہیں''۔

اس نے میرے زخم کرید ڈالے۔ میں بے اختیار رو پڑی۔ اس نے اگلے گاہک کو بلایا اور ہم رخصت ہوئے۔ ہم تینوں اپنے اپنے طور پر مفہوم جاننے کے لئے اس کے لفظ دہراتے رہے۔ میں سادہ لوحی میں یہ سمجھی کہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ عورت بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اطمینان بھی دور نہ تھا۔ اسی شام میں نے نہایت تمیز کے ساتھ ملازمہ سے کچھ لانے کو کہا۔ میرے شوہر نے کراہت سے مجھے گھورا۔ فقیہ اور رقیہ کا بھی خیال نہ کیا اور ڈانٹ کر بولا ''اگلی بار تم اس کے سامنے گڑگڑانا۔ خدا کے لئے ---''

میں کر بھی کیا سکتی تھی؟ میں ملازموں سے اس طرح بات نہیں کر سکتی تھی جیسے وہ میرے ماتحت ہوں۔ مجھے اس کی عادت نہ تھی۔

''تم وہیں چلی جاؤ واپس، جھونپڑیوں میں۔ یہی بہتر ہے''۔ طیش میں باؤلا ہو کر وہ چیخا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

مجھے لگا جیسے میرا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ ''تمہارا مطلب ہے تمہارے باپ کی جھونپڑی میں۔'' میں اتنی زور سے بولی کہ اسے ضرور سنائی دے۔

دیر ہو جونے کے باوجود فقیہ اور رقیہ نے واپسی کی ٹھان لی۔ ناراض اور پریشان فقیہ رخصت ہوتے ہوئے، عادت سے زیادہ تیز آواز میں مجھ سے بولا۔ ''اب وہ کسی کی عزت نہیں کرتا''۔

''اب یہاں ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں''۔ رقیہ بولی۔

آزادی کے بعد پہلی اور آخری مرتبہ وہ ہمارے گھر آئے تو میں نے پوچھ تھا ''کیوں؟'' اس نے کہا کہ اس کے پاس وجہ کوئی نہیں۔ میں نے ایسا سوال کیسے کر لیا؟ مصیبتیں ذہن کو کمزور کر دیتی ہیں۔ جس طرح شخصیتوں کی تاش خراش ہو جاتی ہے، کردار بدل جاتے ہیں۔

صرف تن کے کپڑوں کے ساتھ میں وہاں سے چلی آئی یا جیل کی وردی کا بنڈل میری بغل میں تھا۔ میرا رخ اسٹیشن کی طرف تھا۔

''میرے کاغذ اور جو کچھ قانوناً واجب الادا ہوگا'' حرامزادہ۔ میرے وجود پر

دھند چھائی ہوئی تھی اور میرے پیروں تلے زمین لرز رہی تھی۔

میرے حلق میں گولا سا اٹکا تھا اور سینہ غم سے بوجھل۔ مگر میرا ذہن بالکل خالی تھا جیسے اس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ میری کنپٹیاں درد سے پھٹ رہی تھیں۔ کاش درد ہی تھم جاتا۔ کاش گولہ سرک جاتا۔ کاش سکون واپس مل جاتا۔

پھر مجھ پر مایوسی چھا گئی اور ایک مدت تک میرے اندر رہی۔ دفتری علاقے میں میں مکھی کی طرح گھومتی پھری۔ بڑی کوشش سے میں نے خود پر قابو پانا چاہا کہ یہ دیکھ سکوں کہ میں کیا کر رہی ہوں، کہاں جا رہی ہوں؟ مگر یہ مجھ سے ہو نہ سکا۔ جب میں نے شاہ (رباط سے باہر پرانا قلعہ) کی دیواریں تب مجھے احساس ہوا کہ میں تو غلط سمت چلی آئی ہوں۔ میں ایک منڈیر پر بیٹھ گئی۔ ایک ٹیکسی کو آتے دیکھا تو اسے اشارہ کر کے روکا اور بس سٹیشن کی طرف چلی۔

مجھے کچھ نہیں معلوم کتنی دیر میں ان گلیوں میں پھرتی رہی۔ کس طرح ٹکٹ خریدا، کب بس تک پہنچی کب اس میں بیٹھی اور کب بس چلی۔ مجھے ہوش آیا تو بس دریائے بورج سے گزری تھی۔ رباط اور اس کا قدیم مینار پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی پچھلے زمانے میں پلٹ رہی ہوں۔ اسے دوبارہ جینے کے لئے۔ اور کچھ بھی تو نہیں بدلا اور کم از کم میرے لئے کیا بدلا تھا؟

فیض میں میں نے دوسرے سٹیشن کے لئے بس بدلی۔ میری زندگی سٹیشن سٹیشن پھرتے گزر گئی۔ میرا جسم تھکن اور درد سے چور تھا۔ جیسے مجھے نزلہ زکام ہونے کو ہو۔

گھر کے راستے میں مجھے گرد و پیش کا زیادہ ہوش تھا۔ سیلاب سے ہونے والی تباہ کاریاں دیکھ کر میرا دکھ اور بھی گہرا ہوتا گیا۔

''کیا میں اپنا کمرہ کرایہ پر دینے کا کام آپ کو سونپ سکتی ہوں؟'' میں شیخ سے پوچھتی ہوں جب میں آخری بار ان سے ملنے جاتی ہوں۔

''کوئی اور کام؟''

''اس کے اور خدا حافظ کہنے کے سوا اور کوئی کام نہیں''۔

وہ خدا سے میرے لئے رزق حلال کی دعا کرتے ہیں۔ میں ان سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے صحت و سلامتی کی دعا دیں۔ میری عمر اور میرے حالات میں بیماری سے بڑی

کوئی اور بلا نہیں ہوسکتی۔ میں دعا مانگتی ہوں کہ میرا رب اپنے نور سے ان اندھیروں کو مٹا دے جو میرے گرد جمع ہو گئے ہیں۔

میں اپنا شہر دوسری دفعہ چھوڑتی ہوں۔اس دفعہ مجھے الوداع کہنے والا کوئی نہیں۔ میں الجھی ہوئی ضرور ہوں مگر مجھے کیسا بلا نکا سے خوف نہیں آتا۔ایک پختہ ارادہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ ساری گرد جھاڑ کر از سرنو آغاز کروں۔

ہمارے علاقے میں جو سنہرے پتے خزاں کے رنگ بکھیرتے ہیں وہ بھی گر چکے ہیں۔ٹنڈ منڈ پیڑ سردی کی بارش اور ہواؤں کی یورش میں کھڑے ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد برفباری شروع ہو جائے گی۔ یہ پیڑ طرف کی وسعت میں عجیب عجیب شکلیں اختیار کریں گے۔ جیسے جدید مجسمہ سازی کی فن کاری۔

تیز بارش ہو رہی ہے اور بادل گہرے ہو گئے ہیں۔

فیض ویسے کا ویسا ہے۔اس کا دریا، خچر اور دیواریں۔اب اس کی سڑکیں پختہ ہو گئی ہیں۔اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ یہاں سے آدمی ایک دن میں کیسا بلانکا پہنچ جاتا ہے۔

بارش کے بعد موسم کھل گیا ہے۔سنہری کرنیں نم زمین پر اترتی ہیں۔ ہلکے نیلے آسمان پر بادل کے ٹکڑے اون کے گالوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔

خمسیت :- سواریوں کے لئے پٹرول لینے اور مسافروں کے لئے کھانا اور کافی خریدنے کے لئے سٹاپ۔ یہ بھی بالکل نہیں بدلا۔اس کی بڑی سڑکیں آج بھی کیفوں سے بھری پڑی ہیں۔ مجھے سینما نظر آتا ہے اور محبّ اللہ کی دکان بھی۔میرا دل اچھل پڑا ہے۔ میں بس سے اتر کر تازہ ہوا میں سانس لیتی ہوں۔اس کی خنکی مجھے تازہ دم کر دیتی ہے۔

رباط :-اسے دیکھ کر میرا موڈ بگڑ جاتا ہے۔جتنی دیر بس رکتی ہے میرا دم گھٹنے لگتا۔کیا اس خوبصورت شہر سے میرے دکھ ہمیشہ وابستہ رہیں گے۔

تین سٹیشن، تین سنگ میل، میرا راستہ پھر وہیں سے گزر رہا ہے۔کیسا بلانکا، کیسا بلانکا جیسا کچھ نہیں۔ یہ ہمیشہ مجھے خوش کر دیتا ہے۔ جیسے مجھ جیسے حرماں نصیبوں کو مسکرا کر گلے لگاتا ہو۔میرے اندر جذبات لہریں لینے لگتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے میں اسی

شہر میں بسنا چاہتی ہوں۔

میں بس سے اتر کر سٹیشن سے جلدی نکل جاتی ہوں۔ میرے پاس سامان تو ہے نہیں جس کا انتظار کرنا پڑے۔ سوائے جیل کی اس وردی کے جس پوٹلی بغل میں ہے۔

رقیہ دروازہ کھولتی ہے۔ ذرا سی دیر کو اس کا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ جیسے ہی اسے خیال آتا ہے کہ معاملہ کچھ ٹھیک نہیں اس کے چہرے سے خوشی غائب ہو جاتی ہے۔ میں صحن پار کر کے ایک کمرے تک جاتی ہوں اور بیٹھ جاتی ہوں۔ وہ میرے سامنے آن بیٹھتی ہے اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں تجسس ختم کرنے کو جلدی سے کہتی ہوں۔

''تین مہینے پہلے اس نے مجھے طلاق دے دی اور وطن میں میرے لئے زندگی گذارنے کو کچھ نہیں۔'' میری باتیں سن کر اس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ وہ آنسو پونچھتی ہے۔ میں اسے تسلی دیتی ہوں کہ قیامت نہیں آ رہی اور پھر دیکھتی ہوں کہ میں بھی اس کے ساتھ رو رہی ہوں۔ فقیہ اندر آتا ہے۔ ہمارے جھکے سر دیکھ کر وہ ٹھٹک جاتا ہے کہ کچھ ہوا ہے ضرور۔ وہ مجھے سلام کرتا ہے مگر اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہے۔

''تمہیں پتہ چلا ہے قائد بنا دیا گیا ہوں'' وہ پوچھتا ہے۔ جیسے کوئی اچھی بات کہنے کو ڈھونڈ رہا ہو۔

رقیہ اسے میری خبر سناتی ہے۔ اب سر جھکانے کی اس کی باری ہے۔ میرے اندر ایک خباثت ابھرتی ہے۔ ان کے بدلے ہوئے حالات کو نشانہ کیوں نہ بناؤں جس سے یہ دونوں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ''میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں'' میں کہہ رہی ہوں۔ ''لگتا ہے ان دنوں ہر شخص قائد مقرر کیا جا رہا ہے''۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا''۔ رقیہ کہتی ہے۔ وہ ہماری توجہ اصل مسئلہ کی طرف کرانا چاہتی ہے۔

''مجھے کوئی نہ کوئی ملازمت ڈھونڈنا چاہئے جتنی جلدی ہو اتنا ہی بہتر''۔ میں جواب دیتی ہوں۔ میں اسے وہ بات کہنے سے روکنا چاہتی ہوں کہ کہیں وہ پھر شوہر کے پاس واپس جانے کی بات نہ اٹھائے۔

''نہیں یہ نہیں ہو سکتا'' وہ جواب دیتی ہے۔ فقیہ عادتاً اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔

''میں بحث بالکل نہیں کرنا چاہتی۔ مجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے''۔

''پریشان نہ ہو''۔فقیہ کہتا ہے۔

''میں پریشان نہیں ہوں''، میں ایک مکھی کو مارنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیتی ہوں۔ میں نے دیکھا رقیہ نے اپنے ہونٹ کاٹے۔ہم کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔

''یہ سچ ہے نا رقیہ؟ قنیطرہ کیوں نہیں؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں کیا کروں گا۔قنیطرہ میں؟ ازیلال میں آخر کو کچھ فائدے تو ہیں۔ میں کہتا ہوں میرے انتخاب کی وجہ صحت ہے۔مگر میرا نہیں خیال کہ انہوں نے میرا یقین کیا''۔

رقیہ کچھ نہیں کہتی۔مگر فقیہ بولے جاتا ہے۔''وہاں ڈھیروں انڈے اور مرغیاں ہیں۔وہ دیہات ہے۔سمجھیں''۔

''تم لوگ کب جانے کی سوچ رہے ہو''۔ میں پوچھتی ہوں۔

''پہلے فقیہ جائیں گے، میں بعد میں جاؤں گی'' رقیہ جواب دیتی ہے۔

''میری وجہ سے مت رکو''۔

''تمہارے آنے سے پہلے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا''۔وہ جلدی سے کہتی ہے اس سے پہلے کہ فقیہ بول پائے۔فقیہ بولنا شروع کرتا ہے مگر سنبھل جاتا ہے۔ذرا دیر بعد فاتحانہ طور پر مسکراتا ہے۔''قائد بننے کو ازیلال شاندار جگہ ہے''۔وہ کہتا ہے اور جیب سے ''قف'' کا ایک پیکٹ نکالتا ہے۔

''ازیلال ہے کہاں'' میں پوچھتی ہوں۔

وہ انگشتانہ جتنے چھوٹے سے پائپ میں قف کو احتیاط سے بھرتا ہے۔اسے سلگاتا ہے اور کش لگاتا قف دہکتے انگارے کی طرح جلنے لگتی ہے۔

''اطلس کے قلب میں'' وہ جواب دیتا ہے۔دھواں اس کے منہ اور ناک سے نکل رہا ہے۔''شاندار موسم، شاندار منظر'' وہ اپنی انگلیاں چومتا ہے۔''بالکل سوئٹزرلینڈ لگتا ہے'' دھواں اس کے کانوں سے نکل پڑے گا۔ میرا خیال بھانپتے ہوئے رقیہ کہتی ہے۔ ''تمہارے حق میں بہتر ہے کہ اس لعنت کو چھوڑ دو۔ ورنہ وہ تمہیں خاک میں ملا دیں

گے''۔

''کچھ دنوں میں یہ یورپین سگار اور پائپ پینے لگیں گے''۔ میں ٹکڑا لگاتی ہوں۔ وہ ہنستا ہے۔ایسی ہنسی جو کھانسی سے ملتی ہے۔''کیسا بے ہودہ خیال ہے''۔ وہ کمرے سے ملا جاتا ہے۔اپنی تندرست ٹانگ پر سارا زور ڈالتا ہوا۔

''اب کوئی بات مجھے حیران نہیں کرتی''۔رقیہ کہتی ہے۔''اس نے سوچ لیا کہ وہ ڈرائیونگ کرے گا۔ وہ تو میری ضد نہ ہوتی تو وہ اپنی بات پوری کر کے چھوڑتا۔سوچ سکتی ہو تم اس خراب ٹانگ کے ساتھ ڈرائیونگ''۔

''آزادی نے ان کا دماغ خراب کر دیا ہے''۔

ذرا دیر کو ہم چپ ہو جاتے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔

''فکر مت کرو'' وہ کہتی ہے۔

''مجھے نوکری کبھی نہیں مل سکتی''۔

''ہم کہا کرتے تھے سامراجی حکومت کبھی ختم نہیں ہوگی''۔

''کاش مستقبل حال سے بہتر ہو سکتا''۔

''کتنی دفعہ ہم ان باتوں کے لئے پریشان ہوئے ہیں جو کبھی ہوئی نہیں''۔

''یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ میں ایک عورت ہوں''۔

''بد نصیبی امتیاز نہیں کرتی''۔

میرا مطلب ہے۔اس سب کچھ کے بعد بھی اندھیروں کی طرف لوٹ جانا''۔

''لوگ کہتے ہیں گرگٹ خطرے کے وقت رنگ بدلتا ہے۔ بعد میں پھر اپنے اصلی رنگ میں آجاتا ہے''۔

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں۔ممتا کی گرمی مجھے حیران کر دیتی ہے۔ جو اس کی آواز کی حرکات وسکنات سے ظاہر ہے اور خاص طور پر جب وہ فقیہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

وہ میرا زانو پیار سے تھپتھپاتی ہے۔''کچھ خیال نہ کرو۔ وہ سب کچھ فی سبیل اللہ تھا۔کم سے کم قوم تو عزت سے زندہ ہے۔ میں یہ بات نیک نیتی سے کہہ رہی ہوں۔ یقین کرو''۔

''سمجھتی ہوں۔تمہارے جیسے حالات میں آدمی نیک نیت ہی ہوسکتا ہے''۔

اس کے بعد فقیہ ازیلال چلا جاتا ہے۔سرکاری گاڑی اسے لینے آتی ہے اور وہ کافی ڈرامائی انداز میں رخصت ہوتا ہے۔

ملازمت کی تلاش میں رقیہ میرے ساتھ زیتون کے تیل کے ایک کارخانے میں جاتی ہے۔پہریدار پوچھتا ہے کیا کام ہے۔

''ڈائریکٹر سے ملنا ہے''۔

''آپ نے وقت لیا ہے؟''

''نہیں''۔

''کیوں ملنا چاہتی ہیں آپ؟''

''کام کے لئے''۔

''آپ دونوں کو کام چاہئے؟''

''نہیں،صرف مجھے''۔

''اس سے پہلے کبھی تیل کا کام کیا ہے؟''

''نہیں''۔

وہ اپنا سر ہلاتا ہے۔''ہمارے یہاں کوئی جگہ نہیں''۔وہ اس غرور سے کہتا ہے جیسے کارخانہ اس کے باپ کا ہو۔

''ہمیں اندر جانے دو''۔

''نہیں''۔

''غریبوں کے ساتھ غریبوں سے زیادہ کوئی اور نفرت کا سلوک نہیں کرتا''۔ میں کہتی ہوں۔مجھے غصہ آجاتا ہے۔ایک کار آتی ہے۔وہ کار کو گزرنے کے لئے بیریر اٹھا دیتا ہے اور جلدی سے پھر اسے اپنی جگہ رکھ دیتا ہے۔میں انجن کا شور کم ہونے کا انتظار کرتی ہوں۔''جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں ہم کبھی ترقی نہیں کرسکتے''۔

''اس نے تو اس طرح باز پرس کی جیسے وزیر صنعت ہو''۔رقیہ کہتی ہے۔

میں بدل ہو جاتی ہوں۔اس حد تک کہ ہمت ہار دوں۔ہم بس میں ایک اور فیکٹری کی طرف جاتے ہیں۔اسی بے اعتنائی سے ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمیں تحریری طور پر

درخواست داخل کرنا ہوگی۔

بس میں بیٹھے میں رقیہ سے کہتی ہوں صاف ظاہر ہے کہ اس ملک کو سیکرٹری اور چپڑاسی چلا رہے ہیں۔ رقیہ میری اس سیاسی تنقید سے خوفزدہ ہے۔ آخرکار ہم ایک منشی سے درخواست ٹائپ کرواتے ہیں اور ڈاک میں ڈال دیتے ہیں۔

میرے متعلق خبر سارے محلے میں پھیل جاتی ہے۔ لگتا ہے ہر شخص کو میری زندگی کی ہر بات معلوم ہے حتیٰ کہ میری نوکری کی تلاش کی بات بھی۔ ایک دن میری ایک بہن اپنے شوہر کے ساتھ آتی ہے۔ کسی نے اسے بھی خبر پہنچا دی۔ اسے کیا مطلب تھا۔ وہ مجھ سے توقع کرتی ہے کہ میں رواج کے مطابق دوسری مطلقہ عورتوں کی طرح اپنی بہن کے ساتھ رہوں۔

''اس سے تو مجھے نبٹنے دو۔ دن میں تارے دکھا دیئے ہوں تو''۔ اس کا شوہر اندر آتے ہی کہتا ہے۔ ''لومڑ کہیں کا''۔ زندگی بھر تو انہوں نے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا اب کہہ رہے مکار لومڑ۔ میری ماں اسے اس نام سے پکارا کرتیں تھیں۔

'' تمہاری خبر ہمیں غیروں سے ملی۔ تم نے یہ کیسے گوارا کیا''۔ اس کی بیوی پوچھتی ہے۔ ''ہم بہنیں ہیں کہ دشمن؟''

اس کا شوہر اپنی پہلی بات دہراتا ہے'' مجھے اس کے خلاف شکایت درج کرانے دو''

''کس لئے؟'' میں اس سے غصہ سے پوچھتی ہوں۔ '' قانون جس کی اجازت دیتا ہے وہ سب مجھے مل گیا۔ میں اس پر کس بات کا مقدمہ دائر کروں''۔

''کم از کم کسی وکیل سے تو ملنا چاہئے''۔

''مجھے اس سے کچھ نہیں لینا''۔

رقیہ دروازے پر ان کے جوتے درست کرنے کو رکتی ہے اور اندآ جاتی ہے۔ وہ انہیں سلام کرتی ہے۔ میری بہن میری طرف مڑ کر کہتی ہے۔ ''اپنی چیزیں لے آؤ''۔ میں ان کے ساتھ رہوں؟ اس عمر میں میرا بہنوئی میری کفالت کرے گا؟ نہیں اب ایسا دوبارہ کبھی نہیں ہوگا۔

''کیوں؟'' رقیہ اس سے پوچھتی ہے۔

''یہ ہمارے ساتھ چل رہی ہیں''۔

''میں کسی کے ساتھ نہیں جا رہی ہوں''۔ میں جواب دیتی ہوں۔

''کیا میں تمہاری بہن نہیں ہوں۔ کیا میرا حق زیادہ نہیں ہے؟'' وہ میری طرف دیکھ کر کہتی ہے لیکن اصل میں وہ رقیہ کو سنانا چاہتی ہے۔

''ہم تمہارے رشتہ دار ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے''۔ اس کا شوہر اضافہ کرتا ہے۔

رقیہ خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے تاکہ ہمیں اکیلا چھوڑ دے۔

''میں کسی کی میراث نہیں ہوں''۔ میں اور بھی غصے سے کہتی ہوں۔ ''میں کیسا بلانکا سے نہیں جاؤں گی۔''۔

''کیسا بلانکا؟'' وہ کہتی ہے۔ ''اسے تمہارے باپ نے ترکے میں چھوڑا تھا نا تمہارے لئے؟''

''انہوں نے میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے''۔

ایک لحہ کو میں چپ رہتی ہوں۔ پھر اسے بتاتی ہوں کہ چند فیکٹریوں میں ملازمت کے لئے درخواست بھیجی ہے اور ان کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس کا شوہر حقارت سے کندھے اچکا تا ہے۔ ''آج کل کم از کم ہائی سکول پاس ہونا ضروری ہے۔ تب کہیں نوکری ملتی ہے۔ اب وہ کالج کی ڈگری کی شرط لگانے والے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کالج کی ڈگری بھی سڑکوں پر جھاڑو دینے سے زیادہ ملازمت نہیں دلا پائے گی''۔

''مجھے بس عزت سے روزگار کمانا ہے۔ اس بات کی مجھے پرواہ نہیں کہ وہ کیا ہے۔ میں سرکاری ملازمت تو ڈھونڈ ی نہیں رہی ہوں''۔

''اپنی عمر دیکھو، کیا کر سکتی ہو اب تم؟'' میری بہن پوچھتی ہے۔ بات ماننا تو اس کی عادت ہی نہیں۔

میں یہ پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ مودب، با اخلاق اور شائستہ رہنا اب میرے اختیار میں نہیں رہا۔ اور جب مجھے کوئی دبانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر میں بھک سے اڑ جاتی ہوں اور مجھے یہ خیال نہیں رہتا کہ میرے مقابل کون ہے۔ اس لحہ بھی یہی کچھ ہوا۔ ''تمہیں

مجھ پر قانونی اختیار حاصل ہے کیا؟'' اس کا جواب مجھے معلوم ہے پھر بھی میں پوچھتی ہوں۔

میری بات اسے ایسے لگتی ہے جیسے کسی نے اس کو تھپڑ مار دیا ہو۔اس کا رنگ اڑ جاتا ہے۔وہ دروازے کی طرف لپکتی ہے اس کا میاں پیچھے ہو لیتا ہے غصہ میں بھرے ہوئے وہ جوتے پہننے کو دروازے پر رکتے ہیں۔رقیہ انہیں روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ میری بہن قسمیں کھا کھا کر کہتی ہے کہ وہ ہرگز نہیں رکے گی اور اپنے آپ کو کھینچ کھانچ کر رقیہ کی گرفت سے آزاد کرا لیتی ہے۔

غصہ میں منہ سے نکلے لفظوں کی قیمت ہے بہن سے قطع تعلق۔وہ ہے ہی ایسی۔ اس کے حسن نے اسے بگاڑا اور برباد کیا۔بچپن سے ہی اس کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ ہوتا اور وہ من مانی کرتی اگر کوئی آڑے آتا تو اس سے اس کی جنگ ہو جاتی اور پھر وہ برسوں نہ بھلاتی۔اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ اس سے زیادہ محبت عزت اور وقار کا مستحق اور کوئی نہیں۔اگر اس کے اور شوہر کے درمیان کسی دن اختلاف ہو گیا تو وہ دن قیامت کا دن ہو گا۔

آج پہلی بار میں نے اس کی خواہش کا پاس نہیں کیا۔گو بچپن میں وہ ہزاروں دفعہ میرے ساتھ ایسا کر چکی ہے وہ آج بھی ایسا کرنے پر قادر ہے۔میری صورت حال اس وقت ایسی ہے کہ اس نے مجھے رکھ رکھاؤ، لحاظ اور ادب کی معاشرتی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے۔

میں چھ سات سال اس سے نہیں ملوں گی۔یہ بھی جانتی ہوں کہ شاید پھر کبھی نہ ملوں اور ایسا ہی ہے۔میں اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں وہ رقیہ کے سامنے مجھ پر رعب گانٹھنے آئی تھی۔میری خیریت کا کوئی خیال اسے نہ تھا۔اس کے لئے اس سے زیادہ قابل نفرت اور کوئی بات نہیں کہ کسی اور کی بات اس کی بات سے بڑھ جائے۔چاہے وہ اس کا سگا کیوں نہ ہو۔

شروع شروع میں ہم یہ سمجھتے تھے کہ جدوجہد ہماری کدورتیں اور حسد دھو ڈالے گی۔ویسے ہی جیسے ہمارا خیال یہ تھا کہ آزادی ہمیں فکروں سے آزاد کر دے گی اور ہمارے زخموں کا مداوا اس طرح کر دیا گیا جیسے بازار میں مرہم دستیاب ہوتا ہے۔سچ یہ ہے

کہ ہم نے آزادی کو اس کی ہمت سے زیادہ ذمہ داریاں سونپ دیں ۔اب دن رات ہمارے چاروں طرف دنیا میں آزادی کی جنگ جاری ہے۔فلسطین،ویت نام،کشمیر، بیافرا کتنی اور آنے کو ہیں؟

ایک عورت نے مجھے بتایا کہ فرنچ سنٹرل میں صفائی کرنے والی کی ضرورت ہے۔یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی اور میں انکار کر دیتی ہوں یہ کہہ کر کہ ابھی میں اپنی عرضیوں کے جواب کے انتظار میں ہوں ۔کہیں سے جواب نہیں آتا اور میں یہ بات تسلیم کر لیتی ہوں کہ کہیں سے جواب آئے گا بھی نہیں۔ مجھے اس حقیقت کا سامنا ہے کہ فرانسیسیوں کے بغیر ہمارا اب بھی گذارہ نہیں۔میں اس عورت کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔

فرانسیسی میرے کاغذات دیکھتے ہیں میری زندگی،عمر،صحت اور سماجی حیثیت کے متعلق پوچھ گچھ کرتے ہیں۔بہت سی باتیں مجھے یاد بھی نہیں۔پھر کہتے ہیں''ہم تمہیں لے لیتے ہیں''۔

میں کام شروع کر دیتی ہوں اور ایک کمرہ کرائے پر لیتی ہوں۔رقیہ ازیلال چلی جاتی ہے۔میں پرانا فرنیچر ایک ایک کر کے خریدنے لگتی ہوں۔

جن لوگوں کو میں جانتی تھی ان میں سے کسی سے ملنے کی کوشش نہیں کرتی ۔پھر بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ حالت کی تبدیلی نے انہیں کیا کیا بخشا ہے۔

حاجی علی آج بھی اپنی بھٹی پر کام کرتا ہے۔ایک ایسا شخص جس کی ضرورت جدوجہد کو تھی اور جو یہ جانتا تھا کہ پلٹ کر کیسے آتے ہیں۔اس کے بچے بڑے ہو گئے۔ایک بیٹا انجینئر اور دوسرا یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا۔ مجھے جب بھی اس کا خیال آتا ہے ہر دفعہ نئی تحسین کے ساتھ۔ایک لوہار کی بھٹی سے اٹھ کر کس طرح اس نے اپنے ملک کی خدمت کی،اپنے بچوں کو لکھایا پڑھایا۔ ہر دفعہ یہ بات مجھے نئی طرح سے متاثر کرتی ہے۔

راحل اب مرض میں قائد ہے۔

والٹرترودانت کے باہر ایک قومیائے ہوئے فارم پر رہتا ہے۔شاید وہ حکومت کی طرف سے نگرانی کرتا ہے۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔میں نے سنا ہے اس کی دو بیٹیوں نے مراکشیوں سے بیاہ کر لیا ہے۔

صفیہ کا شوہر کسی جگہ انتظامی عہدہ پر تھا۔آزادی نے صفیہ کو بدل ڈالا۔حلیہ بگڑ گیا اس جیسا کہ اکثر اوروں کے ساتھ ہوا۔اس نے اپنے بال کٹوا لئے اور مغربی لباس میں باہر آنے جانے لگی۔جب میں نے ان عورتوں کا ذکر کیا تھا جو گرمیوں میں فر پہن کر پھرا کرتی تھیں تو میرے ذہن میں صفیہ ہی تھی۔آخری بار میں نے اسے اس دن دیکھا تھا جب اس نے سلک کا لباس چرایا تھا۔میرے ذہن میں اس کی تصویر آج بھی تازہ ہے۔ کیسا بلا نکا سے چلتے وقت میں نے اسے خدا حافظ بھی نہ کہا اور پھر کبھی اس سے نہیں ملی۔

میں رشید کو تو بھول ہی گئی۔وہ الجیرین آدمی جو میرے شوہر کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔اس کی گرفتاری کی خبر بھی یہی لے کر آیا تھا۔تمہیں معلوم ہے؟ وہ الجزائر واپس چلا گیا جہاں اسے کسی اہم عہدہ پر لگا دیا گیا۔کیا میں بھول گئی کسی کو؟ درگاہ کے شیخ، وہ اسی طرح چونچال ہیں وہ بوڑھے ہوئے ہی نہیں۔سال میں ایک بار میری ان کی ملاقات ہوتی ہے جب میں اپنے کمرے کا کرایہ وصول کرنے وطن جاتی ہوں۔چاق و چوبند ہونے پر میں ان سے مذاق کرتی ہوں۔''یہ چستی کہاں سے ملی آپ کو؟ دوسروں کی طرح میں بھی پوچھتی ہوں۔''کہاں سے ملی یہ آپ کو؟''

''میں جو کی روٹی، زیتون اور صاف پانی پیتا ہوں''۔

''کوئی راز ہے جسے آپ چھپا رہے ہیں؟''

''اطمینان---اپنے آپ سے مطمئن ہوں---اس کے سوا اور کچھ نہیں''۔

وہ مسکرا کر کہتے ہیں۔انہیں میرے اندر آنے والی تبدیلی سے خوشی ہوتی ہے۔

''جی ہاں'' میں ان کا خیال بھانپ کر کہتی ہوں۔''میری مایوسی اور ناامیدی ختم ہو گئی ہے۔جیسے میں نے اسے کبھی جانا ہی نہ تھا''۔

''دنیا گذراں ہے۔میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گا''۔

''کیا آپ پچھلی باتیں بھول گئے؟''

''پچھلا کیا ہے۔ایک واہمہ، حقیقت تو وہ ہے جو آج ہے، حال ہو اور آپ کی حقیقت کیا ہے؟''

''کام، یقین اور دوسری بہت سی چیزیں اتنی اہم نہیں ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ میں اپنے خدا کو نہ بھولوں اور اپنی بات کو ذہن سے محو نہ ہونے دوں کہ یہ دنیا عارضی گزرگاہ

ہے اور اگلی زندگی کے انتظار میں یہاں وقت کاٹنا ہے''۔

شیخ خوش نظر آتے ہیں اور پھر مسکراتے ہیں۔''تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

''آہستہ آہستہ، آپ کو یاد ہے سالوں پہلے جب میں کیسا بلانکا واپس گئی تھی۔ میں سمجھتی تھی میری جیسی زندگی کسی اور کی نہیں۔ ایک دن فرنچ کلچرل سنٹر کے ایک ملازم کا رسالہ میرے ہاتھ لگا۔ ٹائٹل پر ایک حسین جوان عورت اور ادھیڑ عمر کے مرد کی تصویر تھی۔ جس عورت کا رسالہ تھا وہ ہنسی اور بولی''سو تم بھی ڈاکٹر برنارڈ میں دلچسپی رکھتی ہو؟''

''کون ہیں یہ؟''

ساؤتھ افریقی ہارٹ سرجن، جس کی آج کل خبریں چھپتی ہیں''۔

''اور یہ عورت کون ہے؟''

''اس کی نئی بیوی۔ پہلی کے ساتھ بیس سال رہا اور جب سرجن کی حیثیت سے شہرت ملی تو اسے طلاق دے دی''۔ وہ بول رہی تھی اور میں دلچسپی سے سن رہی تھی۔''اب پہلی بیوی نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ عورت پر کیا گزرتی ہے جب معاشرے میں اس کے شوہر کی حیثیت بدل جاتی ہے''۔

مجھے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ اس نے رسالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور ورق پلٹنے لگی اور پھر ایک صفحہ نکال کر مجھے پہلی بیوی اس کے بیٹے اور بیٹی کی تصویر دکھائی۔ وہ تصویر دیکھ کر میرے اندر دکھ تیر گیا۔ لوگ ایک دوسرے سے کتنا ملتے ہیں اس عورت کی بپتا میری سمجھ میں کس طرح آئی۔ مجھ سے زیادہ اس کا حال کوئی نہیں سمجھتا۔ جیسے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی سانچے سے اللہ بہت سے پیکر بناتا ہے۔

''شاید وہ بھی ایک روایتی عورت تھی''۔ میں نے خود کو کہتے سنا۔

''وہ ابھی ہے''۔

''میرا مطلب ہے اس جیسی اور بھی ہوں گی۔ شاید یہیں کیسا بلانکا میں''۔ وہ ہنس پڑی۔ اللہ کی رحمت کا ملہ کے خیال نے مجھے جکڑ لیا کہ وہ حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔ اس دن سے مجھے اپنا دکھ کم لگنے لگا۔ میں نے اس کے باوجود جینا شروع کیا جیسے لوگ جسمانی معذوری کے باوجود جینا سیکھ لیتے ہیں۔ اب میں صرف کام کرتی ہوں۔ اپنے

کمرے میں واپس جاتی ہوں اور موجودہ حقیقت میں زندگی بسر کرتی ہوں۔

جیسا میں نے شیخ سے کہا تھا۔ میں نے اپنا ماضی بھلا دیا ہے۔ بالکل بھلا دیا ہے۔ جیسے یہ مجھ پر گذرا ہی نہ ہو اور مجھ سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ دھندلی سی پرچھائیوں کے سوا اس مایوسی کا کوئی نقش نہیں اور عیش کے سال کا تو سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ میں اس سال کو اس لئے عیش کا سال کہتی ہوں کہ وہ (ابرہہ کے ہاتھیوں والے سال) عام الفیل کے مقابلے میں عیش کا سال ہے۔ عام الفیل جو زمانہ قدیم میں گزرا۔

سماجی حیثیت کم ہونے کے باوجود میں مطمئن رہنا چاہتی ہوں۔ میں یقین کرنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں صرف شر ہی نہیں ہے اور یہ کہ ہر چیز نئی ہے اور مختلف بھی اور اتنی اچھی بھی جتنی کہ ہو سکتی ہے۔